مخلصانہ ارشادات پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

اسلام یا ادیان - از جناب احمد کمال عمر صاحب، تقطیع خورد، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۹۶ قیمت درج نہیں، پتہ احمد کمال عمر صاحب ۱/۷۷۵ فیڈرل بی، ایریا، کراچی ۳۸

اس کتابچہ میں دین اسلام کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ قرآن کے نزول سے پہلے بھی اللہ کا دین اسلام ہی تھا، اور حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیاء اسی کو پیش کرتے رہے ہیں اور آیندہ بھی دنیا کیلئے یہی ضابطۂ حیات رہے گا ضمناً قرآن مجید کے سوا تمام الہامی صحیفوں کی تحریف اور قرآن مجید کی حفاظت و اہتمام کا ذکر کیا گیا ہے، آخر میں مسلمانوں کو تمسک بالکتاب کی دعوت دی گئی ہے، لیکن مصنف سے بعض آیتوں کے ترجمہ میں سہو ہو گیا، ان کے بعض خیالات میں بھی ندرت و جدت ہے، مثلاً عربوں کو ام القریٰ کی نسبت سے امی کہا جانا، جو سراسر لغو ہے، دین و شرائع کے فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، اسلیے مصنف کو توراۃ میں اونٹ کے گوشت کی حرمت میں شک اور حضرت مریمؑ کے روزہ میں کلام سے پرہیز کو بحث و جدال سے پرہیز پر محمول کرنے کی ضرورت پیش آئی۔

اچھے شہری اچھی عادتیں سیکھو برائے جماعت پنجم و ششم شہریت کی ابتدائی تعلیم - مرتبہ مولانا ابراہیم عمادی ندوی جامعی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، قیمت اول و دوم عہ/ و سوم ۱۲/، پتہ عثمانیہ کتب خانہ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۲۹ محمد علی بلڈنگ بمبئی ۳

لائق مولف نے بچوں کو شہریت، تمدن، اجتماع اور اخلاق و مذہب کے متعلق ضروری اور اہم معلومات سے واقف کرانے اور انکی عمدہ اخلاقی تعلیم و تربیت اور بہتر ذہنی و دماغی نشو و نما کے لیے کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے بعض کا اس سے پہلے تعارف کرایا جا چکا ہے، یہ تینوں کتابیں بھی اسی سلسلہ کی ہیں، اور ان میں بچوں کو انکے اسکول، خاندان، گھر، گاؤں اور شہر سے لیکر صوبوں اور ملک کی حکومت، ہندوستان کے نظام حکومت اور ادارہ اقوام متحدہ تک اور ضروریات زندگی یعنی ہوا، پانی، سورج، غذا، اور حفظان صحت اور مشہور قومی و مذہبی تہواروں اور خدمت کرنے والے پبلک اور سرکاری محکموں، اسکاؤٹنگ وغیرہ کے متعلق گوناگوں قسم کے اہم اور ضروری معلومات، لکھنے پڑھنے، کھانے پینے ملنے جلنے اٹھنے بیٹھنے و طہارت و نجاست، اور سوسائٹی کے دوسرے آداب اور بعض سائنسی و طبی معلومات اور پیغمبروں، ولیوں اور سادھو سنتوں کے قصے تحریر کیے گئے ہیں، مصنف نے بچوں کی عمر و استعداد کا خیال کر کے انکے مزاج و طبیعت کے موافق عام فہم باتیں لکھی ہیں، انداز بیان دلچسپ ہے لیکن بعض چیزوں کو مکرر سہ کرر لکھا گیا ہے، مولف کا یہ پورا سلسلہ نہایت قابل قدر اور بچوں کے نصاب کے لائق ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۱ ماہ ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۶۸ء عدد ۲

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے حافظ محمد ابراہیم صاحب نے وفات پائی، مرحوم پرانے قوم پرور اور اس دور کے کانگریسی تھے جن کی یادگاریں اب بہت کم باقی ہیں، اپنے حسن اخلاق اور خدمت کی بنا پر اپنے حلقہ میں بڑے مقبول اور اپنا ذاتی اثر رکھتے تھے، انھوں نے لیگ اور کانگریس کے بڑے معرکے کے الیکشن میں لیگی امیدوار کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی اور کانگریس کا وقار قائم کیا، اترپردیش اور مرکزی حکومت میں وزیر رہے، آخر میں کچھ دنوں تک گورنری بھی کی، اگرچہ وہ بڑے وفادار کانگریسی تھے لیکن آخر میں ان کو خود اپنی جماعت سے دھوکا اٹھانا پڑا، اور ان کی زندگی کا آخری دور پریشانی میں گذرا

مرحوم بڑے مرنجا مرنج تھے، مسلمانوں کے معاملات میں بھی ان کی روش یہی تھی، انھوں نے نہ ان کو فائدہ پہنچایا نہ نقصان، ان معاملات میں وہ خاموشی سے کام لیتے تھے، بڑے خوش اخلاق تھے، ہر شخص کو اپنی باتوں سے خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے، جب دارالمصنفین کے لوگوں سے ملاقات ہوتی تو بڑی خصوصیت ظاہر کرتے، ایک مرتبہ بہانتک آمادگی ظاہر کی کہ وہ خود دارالمصنفین آکر اسکی مالی حالت مضبوط کرنے کی کوشش کریں گے، مگر اس کی نوبت نہ آسکی، اب قوم پرور مسلمانوں میں ایسے لوگ نہ ملیں گے، انکی وفات سے ایک پرانی یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے
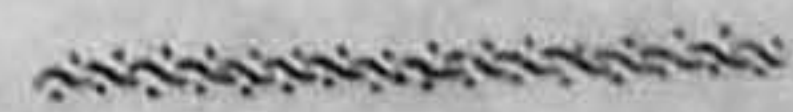
اب مسلمانوں کی خونریزی معمول بن گئی ہے اور وہ اس کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اس بارہ میں کوئی بات کہنے کو نہیں رہ گئی ہے لیکن مسلم دشمنی جس فسطائی ذہنیت کا نتیجہ ہے اب اس نے پورے ملک پر حملہ شروع کر دیا ہے، اس لیے اب یہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ بن گیا ہے، فسطائی جماعتوں کے دلوں سے قانون کا احترام اور حکومت کا خوف بالکل اٹھ گیا ہے، پورے ملک میں انتشار اور بدنظمی برپا، امن و سکون عنقا ہے، آزاد ہندوستان میں مغلوں کے دور زوال کا نقشہ نظر آتا ہے، اور آزادی رحمت کے بجائے زحمت بن گئی ہے، انگریزوں کے زمانہ میں ساری خرابیوں کا الزام ان کے سر منڈھ دیا جاتا تھا لیکن آزادی کے بیس سال گذرنے کے بعد بھی ان میں کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ نئی نئی خرابیاں پیدا ہوتی جاتی اور زندگی کی دشواریاں بڑھتی جاتی ہیں، اور یہ خیال غلط نہیں ہے کہ غلامی کے تصور کو چھوڑ کر ملک کی وحدت اور امن و رفاہیت کے اعتبار سے غلامی کا دور آزادی کے دور سے کہیں بہتر تھا،
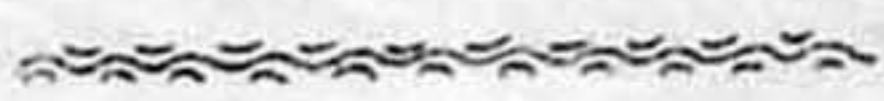
ان تمام خرابیوں کا بنیادی سبب فرقہ پرور جماعتوں کی فسطائی ذہنیت، تعصب، تنگ نظری قوت کا گھمنڈ، اقتدار کی ہوس اور اپنی برتری اور بالادستی کا احساس ہے، اس ذہنیت کا نشانہ اگرچہ سب سے زیادہ مسلمان ہیں لیکن یہ وہ وبا ہے جس کا اثر کسی فرقہ اور اقلیت تک محدود نہیں رہتا، بلکہ پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے، اب یہی صورت حال پیدا ہو گئی ہے، ہندوستان مختلف مذاہب، مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف زبانوں کا گہوارہ ہے، فسطائی طاقتیں ان سب پر اپنی بالادستی، اپنی تہذیب اور اپنی زبان مسلط کرنا چاہتی ہیں جس کو مسلمان کیا کوئی اقلیت بلکہ اکثریت کا وہ طبقہ بھی گوارا نہیں کر سکتا جس کی تہذیب اور جس کی زبان فسطائی طاقتوں کی تہذیب اور زبان سے مختلف ہے، چنانچہ موجودہ سارے لسانی، نسلی اور صوبائی فسادات اسی ذہنیت کا

نتیجہ ہیں، کسی سیاسی پارٹی کو بھی ملک کی فکر نہیں، ہر پارٹی اقتدار کی ہوس اور حکومت کے جنون میں مبتلا ہے اور اس کے لیے اس کو کسی جائز و ناجائز کام میں باک نہیں، ملک کا جو حشر بھی ہو، اس کو حکومت کی کرسی ملنی چاہیے، ان فسطائی جماعتوں کی طاقت روز بروز بڑھتی جاتی ہے، متعدد ریاستوں میں ان کا اقتدار قائم ہو گیا ہے، اس لیے بظاہر اس ذہنیت کے بدلنے کے کوئی آثار نہیں،

ہندوستان کے دستور میں بلا تفریق مذہب و ملت اور اقلیت و اکثریت ملک کے تمام باشندوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں، لیکن اس ذہنیت نے دستوری حقوق کو عملاً معطل کر رکھا ہے، کوئی اقلیت بھی اس سے مطمئن نہیں ہے، مسلمان خاص طور سے ان حقوق سے محروم ہیں، اور یہ فخر تنہا ہندوستان کو حاصل ہے کہ یہاں مسلم دشمنی کے لیے مستقل جماعتیں قائم ہیں، جن کا مقصد ہی مسلمانوں کو مٹانا ہے، ان کا ہر طبقہ اپنے اپنے دائرے میں اس کام کو انجام دے رہا ہے، اس کے لیڈر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں، اخبارات اشتعال انگیز مضامین لکھتے ہیں، مصنفین اپنی تصنیفوں میں اسلام اور مسلمانوں کی نفرت انگیز تصویر پیش کرتے ہیں، معلمین طلبہ کو مسلم دشمنی کا سبق پڑھاتے ہیں، مسلمانوں سے نفرت و عداوت کے سوا اس کا کوئی دوسرا نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا، اور اب یہ ذہنیت اتنی جڑ پکڑ چکی ہے اور فسطائی جماعتیں اتنی طاقتور اور حکومت میں اتنی دخیل ہو چکی ہیں کہ وہ بھی ان کے مقابلہ میں بے بس ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اب یہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے، اس لیے اگر جرأت و ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ نہ کیا گیا تو نہ صرف جمہوریت و سیکولرزم کا خاتمہ بلکہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا جس کی بنیاد پڑ چکی ہے۔

مقالات

حیات سلیمانی کا ایک صفحہ

(وفد خلافت کی روداد سید صاحب کے قلم سے)

(۲)

اتحادیوں کا فیصلہ اور ترکی حکومت کا خاتمہ

ابھی وفد کی کوششیں جاری تھیں کہ اتحادیوں نے ترکی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور ایک ایسا صلح نامہ مرتب کیا جس میں ترکی حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسکو تقسیم کر دیا گیا، کچھ علاقے آزاد کر دیے گئے، کچھ اتحادیوں کی حکم برداری میں دیدیے گئے، کچھ یونان کے حوالے کر دیے گئے، حجاز میں شریف حسین کے خدمات کے صلہ میں ان کی حکومت قائم کر دی گئی، قسطنطنیہ میں برائے نام اتحادیوں کی نگرانی میں ترکی حکومت قائم رکھی گئی، صلح نامہ کی دفعات کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) یورپین ترکی کا کل علاقہ یونان کے حوالہ کیا جائے (۲) سمرنا یونان کو دیا جائے (۳) آرمینیہ اور کردستان کو آزاد کر دیا جائے (۴) قسطنطنیہ ترکوں کے زیر حکومت لیکن درۂ دانیال اتحادیوں کے قبضہ میں رہے گا (۵) عراق و شام اتحادیوں کی حکم برداری میں رہیں گے (۶) حجاز شریف حسین کے ماتحت آزاد ہوگا (۷) مقامات مقدسہ حکومت برطانیہ کے زیر حفاظت رہیں گے (۸) مصر، سوڈان اور قبرص انگریزوں، مراکش و تونس فرانسیسیوں اور طرابلس اٹلی کے زیر حمایت ہوں گے، اور ان ممالک کے متعلق ترکی حکومت کے تمام سابق معاہدے منسوخ ہوں گے (۹) روسی اور جرمنی حکومت

کے ساتھ اس کے معاہدے کالعدم ہوں گے (۱۰) ترکی حکومت کوئی فوج نہیں رکھ سکتی، اس کی فوج کی تعداد مع پولیس ۱۵ ہزار ہوگی، وہ بھی اتحادیوں کی نگرانی میں رہے گی (۱۱) کوئی جنگی اور ہوائی جہاز ترکی حکومت کے قبضہ میں نہ رہے گا (۱۲) تمام فوجی اسکول اور کالج بند کردیے جائیں گے، صرف ایک اسکول ہوگا جس میں نان کمیشنڈ افسر تعلیم پائیں گے (۱۳) وائرلیس ترکی میں نہ رہیگا، اسکے کل موجودہ اسٹیشن توڑ دیے جائیں گے۔ (۱۴) اتحادیوں کے لیے ترکی اپنے خرچ سے ہوابازوں کے اسٹیشن بنائیگی (۱۵) جو بغداد ریلوے ترکی سے گذریگی وہ اتحادیوں کی نگرانی میں رہے گی، جو اسٹیشن نئے بنیں گے وہ اتحادیوں کے زیر حکومت ہوں گے، اور اس ریلوے کے لیے مزدور ترکی حکومت مہیا کرے گی (۱۶) ترکی کے تمام مالی واقتصادی صیغے اتحادیوں کے ہاتھ میں ہوں گے (۱۷) اتحادیوں کے تار گھر ترکی میں الگ ہوں گے (۱۸) چھوٹی تعداد کی قومیں مجلس اقوام کی زیر نگرانی اور کیتھولک سب کی نگرانی میں ہوں گے (۱۹) حجاز میں تمام قوموں کو تجارت کی عام آزادی ہوگی (۲۰) ترکی اپنی بندرگاہوں میں محصول نہ لے گی۔

یہ مسودہ پیرس میں اتحادیوں کے ساختہ پرداختہ ترکی حکومت کے وفد کے حوالہ کردیا گیا، اس صلحنامہ کے معنی ترکی حکومت کے خاتمہ کے تھے، اور ایسا ذلت آمیز صلحنامہ کون مسلمان یا ترک کیا قبول کرتا منصف مزاج یورپین بھی اس کو پسند نہیں کرسکتا، چنانچہ ترکی کے اخبار پیام صباح کے اڈیٹر علی کامل بک نے جو اتحادیوں کا پٹھو تھا اور وہ اس کو ترکی کے مدبر اعظم کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، لکھدیا کہ یہ صلحنامہ ناقابل قبول ہے،

مگر ابھی یہ صلحنامہ کا مسودہ تھا، جس کے رد وقبول کا ترکوں کو اختیار تھا، اور مصطفی کمال کی پارٹی اپنے وطن کی آزادی اور ترکی حکومت کی بقاء کے لیے سرفروشی کررہی تھی، اس لیے وفد خلافت نے بھی اپنی کوشش جاری رکھی،

مسٹر مانٹیگو سے مولوی ابوالقاسم بنگالی کی گفتگو بنگال کے ایک نامور مسلمان مولوی ابوالقاسم اس زمانہ میں

انگلستان میں تھے، جو وفد خلافت کے معین ومددگار ہوگئے تھے، ایک ملاقات میں مسٹر مانٹیگو نے ان سے کہا کہ مجھے مسلمانوں سے بڑی ہمدردی ہے اور میں نے ان کے لیے بڑی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی، اب شرائط صلح پیش کیے جاچکے ہیں اور تصفیہ ہوچکا تو بہتر ہے کہ اب اس معاملہ کو ختم کردو۔ مولوی ابوالقاسم نے کہا، اگر یہی ہے تو کل آپ مسلمانوں کو مسجد جانے سے روک دیں گے اور جب وہ شور وغل کریں گے تو آپ فرمائیں گے کہ خیر اب تو ہوچکا، بہتر ہے کہ اب اس معاملہ کو ختم کردو، جواب دیا کہ نہیں، ایسا کہیں ہوسکتا ہے، دونوں معاملوں میں بہت فرق ہے، مولوی ابوالقاسم نے کہا کہ اس فرق کا فیصلہ ہم ہی کرسکتے ہیں، (ص ۹۶)

آکسفورڈ یونیورسٹی آخر جون میں ارکان وفد آکسفورڈ یونیورسٹی گئے، حضرت سید صاحب نے بڑے غور سے اس کے نظام تعلیم کا مشاہدہ کیا، جس کا ذکر ان کے متعدد خطوط میں ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

۳۰ جون کو ہمارا قافلہ آکسفورڈ گیا تھا، وہاں کے عجائبات علمیہ دیکھے، متعدد کالجوں کا مشاہدہ کیا، کتب خانے دیکھے، انگلستان چونکہ جزیرہ ہے اس لیے یہاں کے باشندوں کو مجبوراً ملاح ہونا چاہیے اور اسی لیے انگلستان دنیا کی سب سے بڑی بحری قوت ہے لیکن معلوم ہے کہ یہ قوت بحری اپنی تعلیم کا آغاز کہاں سے کرتی ہے، کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے، دونوں جگہ منجملہ ورزشوں کے کشتی رانی کا بھی انتظام ہے، اور یہ وہاں کا ایک ضروری حصہ ہے، شہر میں فطری ومصنوعی نہریں ہیں، جن کے کناروں پر ہر کالج کا اپنا گھاٹ ہے جس میں اس کالج کی کشتیاں پڑی ہیں، ہر کالج کی علیحدہ علامت اور نشان ہے، جو کالج کی عمارتوں پر، طلبہ کے لباسوں پر، کشتیوں کے پیزمی گھاٹوں پر بنا ہے، طلبہ اپنے وقت کا بڑا حصہ کشتی رانی میں صرف کرتے ہیں، سال میں ایک مرتبہ لندن آکر کیمبرج اور آکسفورڈ کا مقابلہ ہوتا ہے۔ (ص ۱۰۵)

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:-

آکسفورڈ اور کیمبرج دیکھکر یہ معلوم ہوا کہ مشرقی اور مغربی طرز تعلیم میں کیا فرق ہے، مشرقی طالعلم کا مدعا یہ ہے یا یوں کہئے کہ مشرقی مدارس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم زیر درس علوم میں ماہر ہوجائے، لیکن مغربی طرز تعلیم کا منشا یہ ہے کہ طالب علم کے تمام قوائے جسمانی و دماغی و اخلاقی میں بالیدگی ہو، علاوہ تعلیم کے لہو ولعب، ورزش جسمانی اور کشتی رانی کی خاص مشق کرائی جاتی ہے، ان کے ہاں انجمنیں اور مجلسیں ہیں جن میں پالٹیکس بلکہ انٹرنیشنل پالٹیکس پر آزادانہ بحثیں ہوتی ہیں، ابھی ابھی ایک انگریز طالب علم جس کو حقیقت میں پروفیسر کہنا چاہیے ملا، دیر تک بالشوزم پر گفتگو کرتا رہا، اس نے ایک انجمن ایشیاٹک ایسوسی ایشن قائم کی ہے، جس میں ایشیا کے متعلق ہر حیثیت سے بحث کیجاتی ہے، ٹرکی کے شرائط صلح پر بحث کیجا چکی، پچھلے ہفتہ عراق کے مسئلہ پر بحث تھی، پروفیسر ٹوائنبی ایک بزرگ ہیں جو ترکوں کے شدید دشمن ہیں، گورنمنٹ کی طرف سے آرمینیا کے قتل عام پر جو کتاب ازرق (بلیو بک) لارڈ برائس کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس کے مصنف یہی صاحب ہیں، آیندہ پروفیسر ممدوح اپنے خیالات عالیہ کی اشاعت کے لیے آکسفورڈ کی مجلس مذکور میں جانے والے ہیں،

بہرحال اس سے اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کے محکمۂ تعلیمات کا یہ اصول کہ پالٹیکس کو احاطۂ تعلیم کے اندر نہ داخل ہونا چاہیے اور طلباء ہند سیاست کو شجر ممنوعہ سمجھیں، کس قدر یورپین طریقۂ تعلیم کے منافی ہے، اور اس روک تھام سے ہمارے محکمۂ تعلیم کا مدعا کیا ہے، اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے،

آکسفورڈ میں کل ۱۸، ۱۹ کالج ہیں جن میں طلبہ کی تعداد دو ہزار ہوگی، ان میں ۵، طلبہ ہندوستانی ہیں، ان میں تیس کے قریب مسلمان ہیں، اس سے زیادہ تعداد کیمبرج میں ہے، کیمبرج اور آکسفورڈ دونوں مقامات میں جس قدر کالج ہیں، ان کی عمارتیں بالکل قدیم طرز کی ہیں اور فخراً ان کو اسی حالت میں باقی رکھا گیا ہے، تاکہ ان کی قدامت کا اظہار ہر حیثیت سے ہوتا رہے، یہ قومیں وہ ہیں جو غیروں کی غلامی سے پاک رہی ہیں، اس لیے ان کی قدامت کے یہ آثار

اب تک باقی ہیں

یورپ کی جمہوریت کی حقیقت

یورپ کی جمہوریت جس کی صدائے بازگشت سے ساری دنیا گونج رہی ہے ایک مصری کی نگاہ میں اس کی حقیقت یہ ہے

یورپ کی جمہوریت کا رعب تو یہاں آکر فوراً اتر گیا، یورپ کی جمہوری ترقی کی اصلیت صرف اس قدر ہے کہ ابتدائے ایام میں صرف بادشاہ مالک ہوتا تھا، اس کے بعد زمیندار اور تعلقدار و نواب مالک ہوگئے تھے، جنکو ٹوریز یا کنسرویٹیوز کہتے ہیں، اب تمام تر قوت تاجروں، دولتمند اور سوداگروں کے ہاتھوں میں ہے، جن کا نام لبرل ہے، ان کی سیاست کا مقصد صرف اپنی تجارت کی رونق اور دولت کا حصول ہے اور بس (ص ۱۰۹)

جمہوریت کے معلم فرانس کی جمہوریت کے متعلق یہ رائے ہے

فرانس کی جمہوریت اور آزادی کا افسانہ تو بہت سن چکا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قوم انگریزوں سے بھی زیادہ مستبد اور اقتدار پسند ہے، عوام کو سلطنت میں کوئی دخل نہیں، صرف ارباب جاہ و ثروت کے ہاتھوں میں حکومت ہے، پہلے یہ سن کر بہت خوشی تھی کہ فرنچ اپنی حکومت کو شہنشاہی و بادشاہی اور نوآباد شہریوں کو محکوم اقوام اور دیگر اقوام محکومہ کو انگریزوں کی طرح رعایا نہیں کہتے بلکہ اپنی حکومت کو کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) اور رعایا کو سٹیزن یعنی شہری کہتے ہیں، گویا فرانس کے زیر سایہ بسنے والے ایک ملک و شہر کے سب بھائی بھائی ہیں، لیکن افسوس یورپ آکر معلوم ہوا کہ ہر لفظ سے اس کا اصل مفہوم مراد لینا ضروری نہیں، جیسے لیگ آف نیشنز (مجلس اقوام) انڈیپنڈنٹ (استقلال و خودمختاری) مانڈیٹ (حکمبرداری) سلف ڈٹرمینیشن (اختیار ذاتی) وغیرہ الفاظ کے معنی یورپ میں وہ نہیں سمجھے جاتے جو ایشیا میں از روئے لغت سمجھے جاسکتے ہیں، فرانس کا حق شہریت فرنچ انڈیا،

مراکش، الجیریا اور ٹیونس وغیرہ کے باشندوں کو آپ جانتے ہیں کب حاصل ہو سکتا ہے؟ جب وہاں کے باشندے فرنچ قانون اختیار کرلیں، فرنچ حکومت تسلیم کرلینے کے بعد فرنچ قانون اختیار کرنے کے معنی آپ سمجھے؟ یعنی دیگر قوانین حکومت کے ساتھ نکاح، طلاق، وراثت اور دیگر معاملات میں اپنا مذہبی وقومی قانون چھوڑ دیا جائے جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسلام یا ہندو دھرم کو خیرباد کہو تب فرانس کے حق شہریت کی دولت عظمیٰ مل سکتی ہے، اور تب نوآبادی کا باشندہ ایک فرنچ کے برابر اور مساوی حقوق پاسکتا ہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اپنی قومیت وجنسیت چھوڑ کر فرانسیسی قومیت اختیار کرلو، ظاہر ہے کہ مسلمان اس کو قبول نہیں کرسکتے، اس لیے وہ حق شہریت سے محروم ہیں، اور حقوق میں ایک فرنچ مین کے برابر نہیں ہوسکتے، جمہوریہ فرانس کا شعار (موٹو) یہ چار الفاظ ہیں، اخوت، مساوات، عدالت، آزادی، حکومت کے ہر دفتر اور ایوان کے صدر دروازے پر یہ الفاظ آپ کو کندہ ملیں گے لیکن اس کے معنی آپ وہ نہ سمجھیں جو لغت کی زبان آپ کو بتاتی ہے،

ایک مشہور فرانسیسی مستشرق لوئی مسنیاں کی مجھ سے خط وکتابت ہوئی تو میں نے پوچھا کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں؟ اس نے سچ کہا کہ ان الفاظ کو نہ دیکھو جو در و دیوار پر کندہ نظر آتے ہیں بلکہ ان کو دیکھو جو دلوں میں منقوش ہیں، (ص ۴۷-۱۴۶)

حجاز کے وفد سے دوبارہ ملاقات گو اتحادیوں نے شرائط صلح ترکوں کے حوالہ کردیے تھے، مگر ابھی اس پر دستخط نہیں ہوئے تھے، اس لیے وفد نے اپنی کوششیں برابر جاری رکھیں اور حجاز کے وفد سے بھی تبادلۂ خیالات ہوتا رہا، ایک خط میں لکھتے ہیں:

اس ہفتہ ٹیونس، مصر، شام اور عراق کے ارباب فہم سے ملاقات ہوئی اور طبیعت خوش ہوئی، السکوت تارۃً افصح من المنطق حجاز کے عرب وفد سے آج پھر ملنے گیا، چونکہ عربوں کی طرف سے

ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں سخت غصہ ہے اس لیے ناممکن ہے کہ پہلی ملاقات میں کوئی غیور مسلمان اپنی گفتگو میں اعتدال قائم رکھ سکے، خود میرا پہلی ملاقات میں یہی حال ہوا تھا، لیکن بعد کو خیال ہوا کہ اب اس سے کیا فائدہ، اب تو بھلائی اسی میں ہے کہ اخلاص ومحبت کے ساتھ انکو عواقب ونتائج سے خبردار کیا جائے، چنانچہ بعد کو ان سے یہی وطیرہ اختیار کیا، جناب شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی سالہا سال کے غم وغصہ کھانے کے بعد ابھی پہلی دفعہ ہم لوگوں کے ساتھ ان سے جاکر ملے، بس جاتے ہی برس پڑے، بڑی کوشش سے ان کو روکا، مگر وہ کسی طرح نہ رکے، دو گھنٹے تک بحثا بحثی رہی، وہ اسباب ومصالح اور وجوہ بیان کرتے رہے اور یہ اعتراض کرتے رہے، مجھ سے بدگمان نہ ہوجیے گا اگر میں یہ کہوں کہ اب مجھے عربوں سے ہمدردی ہو چلی ہے،

ٹرکی کا معاملہ اس خط کے پہنچنے سے پہلے سربمہر ہوچکے گا، اس وقت کی پوزیشن یہ ہے کہ اناطولیہ کے ترک جو اب قوم ومملکت ہیں، ان شرائط کے تسلیم واعتراف پر تیار نہیں، قسطنطنیہ کی حکومت جو اتحادیوں کی توپوں کی زد میں ہے، وہ معذور ومجبور ہے۔ (ص ۲۹-۱۲۸)

ٹرکی کا معاملہ اب صرف مصطفیٰ کمال کے زور بازو پر موقوف ہے، یہاں عربوں سے اکثر ملاقاتیں ہوئیں، ان کے بیانات بھی سنے، یورپ کی تعلیم نے تمام اقوام عالم کے کانوں میں قومی وجنسی تفریق کا جو منتر پھونک دیا ہے وہ اب کسی ردسحر سے اتر نہیں سکتا، گو اتحاد اسلامی کے خواب سب کو نظر آتے ہیں، اور کوئی دل اسلام کے انجام کی فکر سے خالی نہیں، لیکن ساتھ ہی اب کوئی قوم کسی دوسری قوم کی ماتحتی بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں، عرب ممبروں نے رائے دی ہے کہ مسلمانان ہند کے لیے بہترین صورت یہ ہے کہ اپنے مطالبات کے ساتھ ایک وفد شریف کے پاس بھیجیں جو مسئلۂ خلافت اور دیگر مسائل کو ان کے سامنے پیش کرے، عربوں کو شکایت ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ہم سے خفا اور برہم اور ہمارا

دستگیری سے بے پرواہیں، ان کو قسطنطنیہ اور تھریس کی دھن ہے، لیکن بلاد مقدسہ کی کوئی فکر نہیں ہم نے کہا، اول تو یہ کلہاڑی آپ ہی نے اپنے پاؤں میں ماری ہے، اس کے علاوہ یہ اعتراض غلط ہے، ہمارے یہ رسالے اور کاغذات ہیں لیجیے اور پڑھیے، کعبہ کو چھوڑ کر ہم کو اور کونسا آستانہ مل سکتا ہے۔ (ص ۱۱۱)

صلح نامہ پر دستخط

۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو قسطنطنیہ کے نمایندوں نے صلحنامہ پر دستخط کر دیے، مگر اس کو ترکی قوم اور ترکی کی نمایندہ حکومت نے تسلیم نہیں کیا، مولانا عبد الباری صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں:

قسطنطنیہ کے بعض آدمیوں نے ۱۰ اگست کو صلح کے معاہدہ پر دستخط کر دیے لیکن نہ اس کو ترکی گورنمنٹ کا اعتراف کہا جا سکتا ہے اور نہ ترک قوم نے اس کو جائز تسلیم کیا ہے، حقیقت میں دنیا کے سیاسی پلیٹ فارم پر ایک تماشہ کھیلا گیا ہے، یہ فقط ایک قسم کی سیاسی صنعت گری ہے، اس معاہدہ کو واقعی ترکوں سے تسلیم کرانے کے لیے لوہے کا قلم اور خون کی سیاہی درکار ہے ...... ترکی کا یہ معاہدہ وحی آسمانی نہیں جو بدل نہ سکے، عزم استقلال اور صبر علی الحق درکار ہے۔ ربنا ثبت اقدامنا۔ (ص ۱۶۶-۱۶۷)

مقامات مقدسہ کی آزادی ہندوستان کی آزادی پر موقوف ہے

صلح نامہ پر دستخط ہو جانے کے بعد لندن میں وفد کا قیام بے کار تھا، اور اگر مستقبل میں کوئی امید باقی تھی تو وہ صرف ہندوستان کی آزادی کی جد وجہد سے، اس کے بغیر مقامات مقدسہ بھی آزاد نہیں ہو سکتے تھے، ایک خط میں مولانا عبد الباری صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں:

خاتمۂ بحث کے طور پر سفر یورپ کے خاتمہ پر میں اپنا سیاسی ایمان وعقیدہ اب آپ کے سامنے اور آپ کے ذریعہ تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کرتا ہوں، ہم مسلمانوں نے تقریباً اپنی عمر کی نصف صدی اس طرح بسر کی کہ ہندوستان کی پالٹکس سے عملاً کوئی غرض و مقصد

نہیں رکھا اور آوارہ و سرگرداں افریقہ اور ایشیا کے صحراؤں اور بیابانوں میں سرمارتے پھرے، ہماری مثال بالکل ایسی تھی کہ ہمارے ہی گھر سے کھڑے ہو کر ہمارے دشمن ہمارے ان بھائیوں پر تیر برسا رہے تھے جو ہمارے گھر سے باہر اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے تھے، ہم ان کو بچانا چاہتے تھے، تو اس طرح کہ اپنے گھروں سے نکل نکل کر دیوانہ وار اپنے بھائیوں کے گھروں کی طرف دوڑتے تھے، اور ان کی چھتوں پر کھڑے ہو کر دشمنوں کو کبھی زجر و توبیخ سے اور کبھی طعن وطنز سے اور کبھی تملق و خوشامد سے اس فعل سے روکتے تھے، کیا یہ حماقت نہیں ہے؟

اگر یورپ کے چھ مہینے کا سفر وزراء سے ملاقاتیں، ارکان سیاست سے مباحثے، پولٹیکل مجلسوں کی شرکت عالمگیر اثر و اقتدار کے اخبارات کے اڈیٹروں سے گفتگو، ممالک اسلامیہ کے حالات پر اطلاع، یورپ کے سیاسی نظامات پر عبور اور موجودہ دنیا کی رفتار سے آگاہی کوئی تسلی بخش یقین واطمینان پیدا کر سکتی ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم کعبہ اور مرقد اخضر کو آزاد کرانا چاہتے ہیں تو ہم کو ہندوستان آزاد کرانا چاہیے، اب ہندوستان کی آئینی آزادی میں کوشش صرف دنیاوی مسئلہ نہیں بلکہ دینی فرض اور مذہبی حق ہے، اب علمائے کرام کو نہ صرف درس و افتا کی خدمات انجام دینا چاہیے بلکہ ان کو صحیح راستہ سے مسلمانوں کو وہ سمجھانا چاہیے جس سے ان کا ملک اپنا ملک ہو، اب کانگریس اور مسلم لیگ صرف چند وکلا، اور پیشہ ور اہل سیاست کی جولانگاہ نہ ہوگی بلکہ تمام مسلمان اپنے پورے مذہبی جوش اور دینی حمیت وغیرت کے ساتھ اس مقدس کام کے لیے آمادہ ہو جائیں گے اور اسوقت تک آرام نہ لیں گے جبتک وہ اپنے ملک میں آزاد نہ ہوں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔ والسلام علی من اتبع الہدیٰ۔ (ص ۱۷۸-۹)

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

مسلمان خود نصف صدی تک ہندوستان کی پالٹکس سے الگ رہے، اور بے فائدہ ہندوستان کے باہر کوہ و بیابان، بحر و بر اور صحرا و ریگستانوں میں آوارہ پھرتے رہے، حالانکہ منزل مقصود

خود ان کا گھر تھا، اگر انکے ہاتھ خود انکے گھر میں مضبوط ہوتے تو گھر سے باہر بھی انکی آواز کی قوت ہوتی، آپ نہیں سمجھ سکتے کہ ہندوستان اور ہندوستانی ہونا ہندوستان سے باہر کس ذلت آمیز تخیل کو پیدا کرتا ہے اور اس ذلت آمیز تخیل کے ساتھ بڑے سے بڑا دعویٰ جو اس کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس کے منہ پر کیا تنک کھلتا ہو، لوگ ہم سے کہتے ہیں اور ہم شرمندگی سے اس کا جواب نہیں دے سکتے، کہ تم جو اس زور وقوت کے دعوی کے ساتھ دنیا کی دوسری قوموں کو آزاد کرانا چاہتے ہو پہلے تم خود تو آزاد بن لو، کیونکہ تم جن لوگوں کو آزاد دیکھنا چاہتے ہو ان کی گرفتاری کے حقیقی سبب بھی تو تم ہی ہو، جو خود تمھاری تلواروں کا مقتول ہو اسکے سرہانے تم اب ماتم کیوں کرتے ہو۔ (ص ۱۷۷)

وفد خلافت کی واپسی اور اٹلی میں امیر فیصل سے ملاقات

وفد خلافت یکم ستمبر کو لندن سے روانہ ہو گیا، حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں شریف حسین کے لڑکے امیر فیصل یورپ جارہے تھے، راستہ میں اٹلی میں وفد خلافت نے ان سے ملاقات کی، اس تفصیل ایک خط میں لکھتے ہیں:

اخبارات کی معرفت یہ پہلے سے معلوم تھا کہ امیر فیصل یورپ آرہے ہیں، عزم قطعی تھا کہ حضرت کی زیارت سے مشرف ہوں، ہمارا راستہ بھی سارے یورپ کو طے کرکے نکلتا تھا، اس لیے یقین تھا کہ راہ میں کہیں نہ کہیں مڈبھیڑ ہوگی، پہلے خیال تھا کہ سوئزرلینڈ شاید نقطۂ اتصال ہو، لیکن یہ غلط نکلا اور آخر اٹلی آکر ان کے اسٹاف اور ہمارے وفد میں تصادم ہوا۔ (ص ۱۸۵)

معلوم ہوا کہ امیر فیصل چند روز پیشتر یہیں میلانو میں تھے اور اب یہاں سے کچھ دور ایک قصبہ میں مقیم ہیں، چنانچہ منزل مقصود قریب پاکر اسی وقت ان کو ۱۰ بجے رات کو ٹیلیفون کیا، وہاں سے اسی وقت جواب آیا کہ کل ۸ کو ۱۱ بجے ملاقات کا وقت ہے، دوسرے دن ۱۰ بجے کے قریب روانہ ہوئے، موٹر سے سوا گھنٹہ کا راستہ تھا، سوا گیارہ بجے کے قریب ان کے ہوٹل میں پہنچے، ان کی طرف سے ایک شامی عیسائی امیر لطف اللہ اور امیر حیدر ایک شامی مسلمان نے

استقبال کیا اور ان کے کمرہ میں لے گئے، کمرہ میں ان کے علاوہ نوری سعید ایک فوجی افسر جن سے لندن میں اور امیر حیدر جن سے پیرس میں ملاقات ہو چکی تھی، اور امیر فیصل کے چھوٹے بھائی امیر زید تھے، رسم ملاقات کے بعد میں نے عربی میں ان سے گفتگو کی، طعن وطنز، ذکر ماضی، فتنۂ حاضرہ، مصائب اسلام کے موضوع کے بعد یہ بحث چھڑی ع گذری جو گذرنی تھی اب چاہیے کیا کرنا۔

گفتگو میں بجائے جلالۃ الملک (ہز مجسٹی) کے دولت الامیر (پرنس) اور جلالۃ الملک حسین کے بجائے ہمیشہ شریف حسین کہتا رہا، یہ گویا اشارہ تھا کہ مسلمانان ہند نے تمھارے خطابات کو تسلیم نہیں کیا ہے، انھوں نے کہا کہ میری نسبت، میرے والد کی نسبت، میرے خاندان کی نسبت اور عموماً تمام عربوں کی نسبت ساری اسلامی دنیا خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں میں بہت غلط خیالات پیدا اور بہت سے الزامات قائم ہیں، افسوس ہے کہ واقعات اس قدر پرپیچ اور مخفی ہیں کہ فیصلہ مشکل ہے، مگر جب وہ اعلان میں آجائیں گے تو ہم کو امید ہے کہ یہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، محمد علی صاحب نے ان کے سامنے بہت سی باتیں پیش کیں، خلافت کے مسئلہ کا ذکر کیا، بلاد مقدسہ کے مستقبل کی گفتگو ہوئی، جو گمان تھا وہ یقین کو پہنچا کہ ان سے انگریز اور فرانسیسی چالبازوں نے اس قدر پُرزور زبانی اور تحریری عہد و مواثیق کیے تھے کہ وہ مستقبل کو نہ سمجھ سکے، ان سیاسی کھلاڑیوں نے جس طرح مشرق کے ہر سیاسی خائن سے برتاؤ کیا وہی ان کے ساتھ بھی کیا، گو وہ اب بھی بہت کچھ امیدیں دلاتے ہیں، لیکن جن کو پہلے پر اعتبار نہیں وہ آیندہ پر کیونکر اعتبار کر سکتا ہے۔

غرض وفد خلافت یورپ میں آٹھ مہینے قیام کے بعد شروع اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ناکام ہندوستان واپس آیا۔

تحریک خلافت میں سید صاحب کا حصہ

ترکی حکومت کا خاتمہ دنیائے اسلام کا سانحہ تھا، اس سے نہ صرف مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ دینی و سیاسی یادگار مٹ گئی تھی بلکہ اتحادیوں کے حلیف شریف حسین

کی وجہ سے جزیرۃ العرب میں اتحادیوں کے اثر و نفوذ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اس لیے وفد خلافت کی واپسی کے بعد احیائے خلافت کی تحریک پوری قوت سے ہندوستان میں جاری رہی، سید صاحب نے اس میں علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے سرگرم حصہ لیا، ۱۹۲۰ء میں میرٹھ میں سید صاحب کی صدارت میں خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا، اس میں انھوں نے خلافت کے مسئلہ پر ایسا اہم خطبہ پڑھا جو خلافت کی تاریخ میں یادگار رہے گا، خلافت اسلامیہ کی دینی اور سیاسی حیثیت پر مسلسل مضامین لکھے جن میں سے بعض مضمون کتابی شکل میں شائع ہوئے، پہلا مضمون "خلافت اور ہندوستان" کے عنوان سے لکھا جو دسمبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں شائع ہوا، اس میں دکھایا گیا ہے کہ خلافت کی تحریک محض سیاسی لہر نہیں ہے بلکہ خلافت اسلامیہ سے ہندوستانی مسلمانوں اور یہاں کے مسلمان سلاطین کا بڑا گہرا تعلق اور انکو آستان خلافت سے بڑی عقیدت رہی ہے، اس مضمون پر اڈیٹر صبح امید حکمت لکھنوی نے چند تاریخی اعتراضات کیے تھے، سید صاحب نے فروری ۱۹۲۱ء کے معارف میں اس کا مفصل جواب دیا، پھر مارچ میں "خلفائے اسلام کا اثر و اقتدار" کے عنوان سے اس کا تکملہ لکھا جسمیں دکھایا ہے کہ خلافت عباسیہ کے ضعف و زوال کے زمانہ میں بھی اس کی مذہبی سیادت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، ساری دنیائے اسلام اس کو تسلیم کرتی تھی، پھر ستمبر ۱۹۲۱ء میں اس کے مزید ثبوت میں بعض غزنوی سلاطین کے بیعت ناموں پر ایک مضمون لکھا، اکتوبر ۱۹۲۱ء میں "خلافت اور ہندوستان" کے عنوان سے ایک دوسرا مضمون لکھا جس میں آل عثمان سے سلاطین ہند کا تعلق اور ان کی عقیدت دکھائی، یہ مضمون پہلے مضمون کا گویا تکملہ تھا، پھر نومبر و دسمبر ۱۹۲۱ء اور فروری و مارچ ۱۹۲۲ء کے معارف میں "خلافت اسلامیہ اور دنیائے اسلام" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جس میں خلافت عثمانیہ کے ساتھ دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی عقیدت دکھائی، پھر جون ۱۹۲۲ء کے معارف میں "خلافت عثمانیہ اور مسیحی دنیا کا اعتراف" کے عنوان سے ایک مضمون لکھکر اس سلسلہ کے ہر پہلو کو بالکل مکمل کر دیا، تحریک خلافت کے زمانہ میں ان مضامین

کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ بعض کو کتابی شکل میں شائع کرنا پڑا۔

خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے اثرات محض ترکی حکومت تک محدود نہ تھے، بلکہ اس سے جزیرۃ العرب میں اتحادیوں کی مداخلت کا اندیشہ تھا، اس لیے بہار خلافت کانفرنس ۱۹۲۳ء کے خطبۂ صدارت میں مذہبی نقطۂ نظر سے جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کی مداخلت پر بڑی تفصیلی بحث کی اور مذہبی و تاریخی دلائل و شواہد سے ثابت کیا کہ ارض مقدس پر مسلمانوں کے سوا اور کسی کا حق نہیں ہے، اور اس میں ان کی کسی قسم کی مداخلت گوارا نہیں کیجا سکتی، اس خطبہ کا ایک حصہ اکتوبر ۱۹۲۳ء کے معارف میں شائع ہوا، پھر "ارض حرم اور اس کے احکام و مصالح قرآن مجید کی نظر میں" کے عنوان سے معارف میں ایک مفصل مضمون لکھا جس میں یہ دکھایا ہے کہ ظہور اسلام سے نہ صرف مشرکین عرب بلکہ یہود و نصاریٰ کے عقائد و اعمال، دینی سیادت اور دنیاوی اقتدار پر بھی کاری ضرب لگی تھی اس لیے وہ ابتدا ہی سے اس کے دشمن بن گئے تھے، اور ان سب نے مل کر اسلام اور مسلمانوں کے استیصال کی کوشش کی، اور انکی یہ دشمنی ہمیشہ قائم رہی، اس لیے جزیرۃ العرب میں ان کا وجود اسلام اور مسلمانوں دونوں کے لیے مستقل فتنہ تھا، انکی موجودگی میں توحید کا احیاء اور اسلام کی اشاعت اور اسکا تحفظ ممکن ہی نہیں تھا، اسلیے یہ ضروری تھا کہ سرچشمۂ اسلام کو انکے ہر قسم کے اثرات سے محفوظ رکھا جائے، اسلیے ارض حرم میں انکی قربت اور جزیرۃ العرب میں انکے قیام کی ممانعت کر دی گئی، بعد کے واقعات نے اسکو بالکل صحیح ثابت کر دیا، چنانچہ یہود و نصاریٰ ہر زمانہ میں مسلمانوں کی مخالفت اور جزیرۃ العرب میں ریشہ دوانیاں کرتے رہے جس کا سلسلہ آجتک جاری ہے، اسرائیل اور عربوں کی موجودہ جنگ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اگر انکو جزیرۃ العرب میں قیام کا موقع مل جاتا تو نہ صرف ارض حرم شرک سے پاک نہ ہو سکتی بلکہ غیر مسلموں کی آئے دن کی فتنہ طرازیوں سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچتا، اسلیے کسی زمانہ میں بھی جزیرۃ العرب میں کسی غیر مسلم کی مداخلت کو گوارا نہیں کیا جا سکتا، جب تک خلافت کی تحریک جاری رہی سید صاحب اس میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔

امام شافعیؒ اور انکی خدمات

از مولوی حافظ محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی ناظر کتب خانہ دار المصنفین

(۲)

تبحر علمی و فصاحت بیانی امام شافعیؒ کی یہ بڑی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اپنی عنان توجہ جس طرف بھی پھیری اس میں کمال حاصل کرکے چھوڑا، چنانچہ ابتدائے عمر میں جب وہ شعروادب کی طرف مائل ہوئے تو افصح العرب قبیلہ ہذیل میں برسہا برس قیام کرکے شعروادب کے رموز سیکھے اور اس میں اتنی مہارت پیدا کی کہ اصمعی جیسا جلیل المرتبت ادیب و لغوی ان سے ہذلیین کے دیوان پڑھنے کا ذکر نہایت فخر و ابتہاج کے ساتھ کرتا ہے[1]،

امام صاحب علم و فن کے ہر شعبہ سے بہرۂ وافر رکھتے تھے، اللہ جل شانہٗ نے انھیں کتاب اللہ، سنت رسول اللہؐ، کلام صحابہؓ، آثار سلف اور اختلاف اقاویل علماء، پھر معرفت کلام عرب، لغت، عربیت اور شعر وغیرہ میں علم عمیق ارزانی فرمایا تھا[2]،

مذکورۂ بالا علوم و فنون میں کمال کے باوجود ان کے اصلی علوم حدیث و فقہ تھے، وہ حافظ حدیث تھے، امام مالک سے موطا کی قرأت کی تھی، اور اپنی اخاذ طبیعت کی بنا پر عام روش سے ہٹ کر اس میں نئی نئی راہیں پیدا کیں، ان کے مذہب کی بنیاد صحیح حدیث پر قائم ہے، خود ہی فرماتے ہیں اذا صح الحدیث فهو مذهبی[3]، امام احمد بن حنبل سے فرمایا کرتے تھے کہ تم حدیث و رجال کا

[1] مناقب للامام الشافعی ص ۱۵۳ [2] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۱۴ [3] مختصر صفوة الصفوة لابن جوزی ص ۲۱۴،

علم مجھ سے زیادہ رکھتے ہو پس جب کوئی صحیح حدیث تمھاری نظر سے گذرے تو مجھے بتاؤ خواہ وہ کوفی ہو یا بصری اور شامی، اگر وہ صحیح ہوگی تو میں اسے اختیار کرلوں گا[1]، امام صاحب کا یہ اعلان عام تھا کہ اگر میرا کوئی قول سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہو تو اس کو ترک کردو، نیز امام احمد فرماتے ہیں کہ جب کوئی حدیث امام شافعی کے نزدیک صحیح ثابت ہو جاتی تھی، تو وہ اس کے قائل ہو جاتے تھے[2]،

امام شافعی نے اپنے وقت کے محدثین کی غفلت کو رفع کرکے ان میں نئی روح پھونکی، زعفرانی بیان کرتے ہیں کہ

کان اصحاب الحدیث رقوداً حتی جاء الشافعی فایقظهم فتیقظوا[3] — تمام محدثین خواب غفلت میں مبتلا تھے، امام شافعی نے اگر ان میں بیداری پیدا کی۔

حدیث سے استدلال میں امام شافعی کے مسلک میں احتیاط کا پہلو بہت نمایاں ہے، اسی بنا پر بعض مسائل میں عام ائمہ و مجتہدین کے مسلمہ اصول و ضوابط سے الگ ان کی منفرد رائے ہوتی ہے، مثلاً مراسیل صحابہ سے استدلال تمام ائمہ کے نزدیک جائز ہے، اور تابعین سے لیکر دوسری صدی تک کے مجتہدین میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا، لیکن امام شافعی مرسل حدیث سے استدلال کو جائز قرار نہیں دیتے اور یہ اختلاف صرف احتیاط پر مبنی ہے۔

علم حدیث اور اس کے متعلقات میں آپ کے تبحر کا اعتراف خود آپکے اساتذہ کو بھی تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی کتابوں کی سماعت کے لیے ان کے پاس ایک وقت میں سات سات سو تشنگانِ علم کا ہجوم رہتا تھا[4]، امام احمد فرماتے ہیں کہ مجھے ناسخ و منسوخ حدیث کا پتہ اسی وقت چلا

[1] الانتقاء لابن عبدالبر ص ۵، [2] معجم المصنفین ج ۲ ص ۴۸، ۲ [3] ابو الفداء ج ۲ ص ۲۶، الدیباج المذہب ص ۲۲۸؛ التاج المکلل ص ۶۰ [4] الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۴۳

جب میں امام شافعی کی خدمت میں حاضر ہوا اور تعلیم حاصل کی[1]، ابوحاتم رازی کا قول ہے کہ

لولا الشافعی لکان اصحاب الحدیث فی عمی[2]	اگر امام شافعی نہ ہوتے تو اصحاب حدیث تاریکی میں رہتے۔

ایک اور بزرگ کا بیان ہے کہ

ما اعلم للشافعی حدیثاً خطأ[3]	مجھے امام شافعی کی کسی غلط حدیث کا علم نہیں،

امام محمد بن حسن کا ارشاد ہے

ان تکلم اصحاب الحدیث یوماً فبلسان الشافعی[4]	اصحاب حدیث ہمیشہ امام شافعی ہی کی زبان میں کلام کریں گے،

صاحب روضات نے لکھا ہے کہ

ان الشافعی اول من تکلم فی مختلف الحدیث وصنف فیہ[5]	بلاشبہ امام شافعی پہلے شخص ہیں جنھوں نے مختلف الحدیث کے بارے میں کلام کیا اور اس فن میں کتاب تصنیف کی،

اسی طرح امام شافعی فقہ میں بھی مجتہدانہ مقام رکھتے تھے، ان کی الرسالہ اور کتاب الام اس کی شاہد عادل ہیں، وہ فقہ کے تمام مراکز سے مستفید ہوئے تھے، مثلاً مکہ کے رئیس الفقہ ابن جریج کی کتابوں کو ان کے شاگردوں مسلم بن خالد اور سعید بن سالم سے پڑھا، مدینہ کے رئیس الفقہ امام مالک کی فقہ کو براہ راست ان سے حاصل کیا، عراق کے فقیہ اکبر امام ابوحنیفہ کے علوم کو ان کے تلمیذ رشید امام محمد سے حاصل کیا، اس طرح امام شافعی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ علوم اہل الرای اور اہل الحدیث کے جامع ہیں[6]، امام احمد فرماتے ہیں کہ

---

[1] ابوالفداء ج ۲ ص ۲۶ - الدیباج المذہب ص ۲۲۷ - التاج المکلل ص ۷۰ [2] مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۹ [3] العبر فی خبر من غبر ج ۲ ص ۳۴۴ [4] مرآۃ الجنان ص ۲۰ [5] روضات الجنات ج ۴ ص ۵۴ [6] توالی التاسیس ص ۵۴

کان الفقہ قفلاً علی اہلہ حتی فتحہ اللہ بالشافعی[1]	فقہ فقیہوں کے لیے ایک قفل تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے شافعی کے ذریعہ کھولا

غرض امام شافعی کے حدیث و فقہ اور دیگر علوم و فنون میں تبحر کا یہ عالم تھا کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ وہ کس فن میں خصوصی ملکہ رکھتے تھے، یونس بن عبدالاعلیٰ کا بیان ہے کہ جب امام شافعی عربیت کے متعلق گفتگو فرماتے تو میں کہتا کہ آپ اسی میں ماہر ہیں، جب شعر و ادب میں گہر افشانی کرتے تو میں ان کو اسی کا سب سے بڑا عالم سمجھتا اور جب فقہی مباحث کو بیان کرتے تو میں اسی میں سب سے زیادہ واقفیت رکھنے والا سمجھتا[2]،

ہارون بن سعید کا قول ہے کہ اگر امام شافعی پتھر کے ستون کو لکڑی کا ثابت کرنا چاہیں تو بخدا انھیں اس پر قدرت حاصل ہے[3]،

امام صاحب کو ہذلیین کے دس ہزار اشعار زبانی یاد تھے، قبیلۂ ہذیل میں مدت دراز تک رہنے کی وجہ سے امام صاحب بھی انتہائی فصیح اللسان ہوگئے، عبداللہ بن احمد کا قول ہے کہ کان الشافعی من افصح الناس[4]۔ یونس کہتے ہیں کہ امام شافعی کے الفاظ میں نشہ کی سی مستی ہوتی تھی، جب ہم ان کے حلقہ میں بیٹھ کر گفتگو سنتے تو معلوم ہوتا جیسے وہ سحر کر رہے ہوں[5]۔

بشر المریسی کا بیان ہے کہ

کان لسانہ ینظم الدرر[6]	ان کی زبان موتی پروتی تھی۔

ابن ہشام نحوی فرماتے ہیں کہ

طالت مجالستنا للشافعی	بہت دنوں تک شافعی کی صحبت میں رہا

---

[1] معجم الادباء ج ۶ ص ۳۸۹ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۸۰ [3] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۶۰ [4] الانتقاء لابن عبدالبر ص ۹۳ [5] معجم المصنفین ج ۲ ص ۲۶۹ [6] مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۹

فما سمعت منه لحنۃ قط	میں نے ان سے کبھی زبان کی غلطی
ولا کلمۃ غیرھا احسن منھا[1]	نہیں سنی اور نہ کوئی کلمہ ایسا سنا جس سے بہتر دوسرا کلمہ کہا جاسکتا ہو۔

زعفرانی کا قول ہے کہ میں نے امام شافعی سے زیادہ فصیح اللسان کسی کو نہیں دیکھا۔[2]

فصاحت و بلاغت کے ساتھ امام شافعی لسانیات اور لغت میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے، اس میں ان کے کلام کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا تھا، ابن ہشام صاحب لغازی جیسی شخصیت نے کان الشافعی حجۃ فی اللغۃ کے الفاظ[3] میں اسکا اعتراف کیا ہے،

ایک دوسرے بزرگ کا قول ہے "الشافعی کلامہ لغۃ یحتج بھا"[4]

امام شافعی اور علم اصول فقہ امام شافعی کا سب سے عظیم کارنامہ اصول فقہ کی ایجاد ہے، فن کی شکل میں سب سے پہلے ان ہی نے اس کی بنیاد رکھی، اسنوی کا قول ہے کہ ان الشافعی ھو اول من صنف فی اصول الفقہ باجماع[5]۔

علامہ فخرالدین رازی نے لکھا ہے کہ باتفاق امت امام شافعی اصول فقہ کے بانی ہیں اور ان ہی نے اس علم کے ابواب کو مرتب کیا، اور قوت وضعف کے مراتب کی تشریح کی[6]، علماء کا بیان ہے کہ علم اصول فقہ کی نسبت امام شافعی کی طرف بالکل اسی طرح ہے جیسے منطق کی ارسطاطالیس کی طرف[7]،

بدرالدین زرکشی کہتے ہیں کہ امام شافعی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اصول فقہ میں تصنیف کی، اس فن میں انھوں نے کتاب الرسالہ، کتاب احکام القرآن، اختلاف الحدیث، ابطال الاستحسان

[1] معجم الادباء ج ۶ ص ۳۸۸ [2] الانتقاء لابن عبدالبر ص ۹۰ [3] ایضاً [4] معجم الادباء ج ۶ ص ۳۷۹ [5] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۰، ابجد العلوم ص ۷۷۳، کشف الظنون ج ۲ ص ۳۴۴ [6] مناقب الامام الشافعی ص ۹۸ [7] مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۸

کتاب جماع العلم، اور کتاب القیاس لکھکر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا۔[1]

ابن خلدون رقمطراز ہیں کہ "امام شافعی کو اصول فقہ پر تصنیف میں اولیت حاصل ہے، اس فن میں انھوں نے اپنا مشہور "الرسالہ" تصنیف کیا، جس میں انھوں نے اوامر و نواہی کا بیان اور خبر، نسخ اور قیاس سے علت منصوصہ کے حکم کے بارے میں کلام کیا ہے، پھر اس کے بعد حنفی فقہاء نے اس فن میں کتابیں لکھیں"[2]۔

ان بیانات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ امام شافعی ہی کو اصول فقہ کے بانی اور واضع ہونے کا شرف حاصل ہے بعض علماء کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اس فن میں سب سے پہلے امام محمد نے کتاب لکھی،

مستشرقین یورپ نے بھی امام شافعی کو اس فن کا پہلا مصنف قرار دیا ہے، گولڈ زیہر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں لفظ "فقہ" کے تحت لکھتا ہے:

"محمد بن ادریس الشافعی کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ انھوں نے مسائل شرعیہ کو مستنبط کرنے کے ضوابط وضع کیے اور تمام اصولوں کی حدبندی کی اور اپنے "رسالہ" میں قیاس عقلی کے ایسے اصول ایجاد کیے جنکی طرف قانون سازی کے وقت رجوع کرنا نہایت ضروری ہے۔"

ان گوناگوں خصوصیات کی بنا پر امام احمد نے بجا فرمایا تھا کہ

الشافعی للعالم کالشمس للدنیا	امام شافعی کی حیثیت علم کے لیے ایسی ہی تھی
وکالعافیۃ للبدن ھل لھذین	جیسے دنیا کے لیے سورج کی اور جسم کیلئے صحت کی
من خلف او عنھما عوض[3]	کیا ان دونوں کا کوئی بدل ہوسکتا ہے۔

[1] البحر المحیط بحوالہ امام شافعی ص ۶۱ [2] مقدمہ ابن خلدون ج ۱ ص ۴۹۸ [3] الدیباج المذہب ص ۲۲۹؛ مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۷

تصانیف امام شافعی نے مختلف علوم و فنون میں بکثرت کتابیں لکھیں، جن کی تعداد کے متعلق متضاد بیانات ہیں، حافظ ابن حجر نے ڈیڑھ سو کتابوں کے نام شمار کرائے ہیں[1]، ابن ندیم نے ایک سو پانچ[2] اور ابن زولاق نے دو سو تک کتابوں کی تعداد بتائی ہے[3]، ایسے کثیر التصانیف مصنف کی مثال تاریخ میں خال خال ہی ملتی ہے، ان تمام تصانیف میں سے اکثر تو کتاب الام مطبوعہ مصر میں یکجا شائع ہو چکی ہیں[4]، اور بعض مخطوط شکل میں مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں،

امام شافعی کی قول قدیم کی کتابوں میں کتاب الحجۃ سب سے مشہور ہے جو امام صاحب نے بغداد کے آخری قیام کے زمانہ میں تصنیف کی تھی، اس کے سبب تالیف کے متعلق خود بیان فرماتے ہیں کہ "میرے پاس محدثین کی ایک جماعت آئی اور مجھ سے درخواست کی کہ میں امام ابو حنیفہ کی کتاب کا رد لکھوں، میں نے ان سے کہا کہ جب تک میری نظر سے امام اعظم کے مذہب سے متعلق تمام کتابیں نہ گذر جائیں میں ان کے اقوال سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکتا، چنانچہ میرے پاس امام محمد بن حسن شیبانی (صاحب ابی حنیفہ) کی کتابیں لائی گئیں، جن کا میں نے ایک سال تک بغور مطالعہ کیا حتی کہ وہ مجھے زبانی یاد ہو گئیں، ان کے مطالعہ کے بعد میں نے اپنی بغدادی کتاب "الحجۃ" تصنیف کی۔"[5]

حاجی خلیفہ نے کتاب الحجۃ کے متعلق لکھا ہے کہ

ھو مجلد ضخم الفہ بالعراق	یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو عراق میں لکھی گئی
اذا اطلق القدیم من مذھبہ	جب مطلق مذہب قدیم بولا جائے تو اس سے یہی
یراد بہ ھذا التصنیف[6]	کتاب مراد لیجاتی ہے۔

اس کے علاوہ امام شافعی کی تین کتابیں جو مذہب جدید سے متعلق ہیں، بہت مشہور اور

[1] توالی التاسیس ص ۶۴،۱ [2] الفہرست ۲۹۵ [3] شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۰ [4] معجم الادباء ج ۶ ص ۳۹۵ [5] توالی التاسیس ص ۶۰ [6] کشف الظنون ج ۱ ص ۲۴۴

امتیازی حیثیت کی حامل ہیں،

۱۔ **کتاب الام**۔ یہ کتاب امام شافعی کے مذہب جدید کی اہم تصنیف ہے، امام الحرمین وغیرہ کا خیال ہے کہ یہ امام شافعی کی قدیم کتابوں میں ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کی روایت ربیع بن سلیمان مرادی نے کی ہے، جو مصری ہیں[1]، یہ کتاب پندرہ جلدوں میں ہے، جس کے کتب (ابواب یا اجزاء) کی تعداد مجموعی طور پر ایک سو پچاس ہے[2]، کتاب الطہارۃ سے آغاز ہوا ہے،

کتاب الام کو امام شافعی کے شاگرد ربیع بن سلیمان مرادی نے روایت کیا ہے[3]، لیکن حاجی خلیفہ نے اس کی تغلیط کرتے ہوئے لکھا ہے کہ درحقیقت اس کے راوی بویطی ہیں، مگر انھوں نے اپنا نام ذکر نہیں کیا، ربیع بن سلیمان نے صرف اس کی تبویب کی ہے، اور اسی بناپر نفس کتاب کو بھی ان ہی کی طرف منسوب کر دیا گیا۔[4]

صاحب کشف الظنون کی یہ تحقیق سور تفاہم پر مبنی ہے، اصل میں پوری کتاب تو ربیع بن سلیمان ہی نے امام شافعی سے روایت کی ہے، لیکن ابتدا کی چند روایات بواسطہ بویطی کے منقول ہیں، شاید اسی اشتباہ کی بناپر حاجی خلیفہ نے پوری کتاب کو بویطی کی روایت قرار دیدیا، علامہ ابن ندیم نے بھی لکھا ہے کہ "رواہ عن الشافعی الربیع بن سلیمان"[5]

کتاب الام کے حاشیہ پر مزنی (المتوفی ۲۶۴ھ) کی مختصر کبیر بھی مندرج ہے، یہ کتاب سب سے پہلے مطبعۃ الکبری الامیریہ بولاق مصر سے ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوئی،[6]

۲۔ **الرسالۃ**۔ یہ کتاب اصول فقہ میں ہے، امام الحدیث عبد الرحمن بن مہدی نے امام شافعی سے درخواست کی تھی کہ ایک ایسی کتاب تصنیف کیجئے جس میں کتاب و سنت اور اجماع و قیاس سے استدلال کے شرائط اور ناسخ و منسوخ اور عموم و خصوص کے مراتب کا بیان ہو، اس فرمائش

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۲ [2] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۶ [3] معجم المطبوعات ج ۱ ص ۱۰۹۶ [4] کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۶ [5] بستان المحدثین ص ۳۰ [6] فہرست ابن ندیم ص ۲۹۵ [7] معجم المطبوعات ج ۱ ص ۱۰۹۶

پر امام شافعی نے "الرسالۃ" تصنیف فرمائی[۱]، اور اسے عبدالرحمن بن مہدی کے پاس بھیجا، انھوں نے پڑھکر بے ساختہ فرمایا کہ "ماظننت ان اللہ خلق مثل ھذا الرجل"[۲] وہ فرمایا کرتے کہ میں ہر نماز کے بعد امام شافعی کے لیے دعا کرتا ہوں[۳]۔

صاحب المعجم کتاب الرسالۃ کے متعلق لکھتے ہیں "ھو اول کتاب الف فی ھذا العلم" اس کا پہلا اڈیشن مصر سے ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوا[۴]، امام شافعی کے تلامذہ کی ایک بڑی تعداد نے اس کتاب کی روایت کی ہے، اس کے شارحین میں ابوبکر محمد بن عبداللہ الشیبانی (المتوفی ۳۳۰ھ) امام شاشی (المتوفی ۳۶۵ھ) حسان بن محمد نیساپوری (المتوفی ۳۴۹ھ) صیرفی (المتوفی ۳۳۰ھ) کے نام مشہور و ممتاز ہیں[۵]۔

۲- **مسند شافعی** - یہ کتاب احادیث مرفوعہ پر مشتمل ہے، جن کو خود امام شافعی اپنے تلامذہ کے روبرو سند کے ساتھ روایت کیا کرتے تھے، یہ امام شافعی کی اپنی تصنیف نہیں ہے، بلکہ کتاب الام اور مبسوط میں جو احادیث ربیع بن سلیمان اور مزنی سے مروی ہیں، ابوجعفر محمد ابن مطر نیشاپوری نے ان کا انتخاب مسند امام شافعی کے نام سے جمع کردیا ہے، چونکہ کتاب الام کی احادیث ابوالعباس محمد بن یعقوب اصم نے ربیع بن سلیمان (جو امام شافعی کے بلاواسطہ شاگرد ہیں) سے سن کر جمع کی تھیں، اسی لیے مسند کے جامع کی حیثیت سے بھی وہی مشہور ہیں، بعض علماء کا قول ہے کہ خود ابوالعباس نے ان حدیثوں کا انتخاب کیا تھا، اور محمد بن مطر صرف اس کے کاتب تھے، یہ مسند نہ تو مسانید ہی کی ترتیب پر ہے نہ ابواب کی، بلکہ کیف ما اتفق انتخاب کرکے حدیثوں کو جمع کردیا گیا ہے، اسی لیے اس میں تکرار بہت زیادہ ہے[۵]۔

۱ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۵۶، شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۱، معجم الادباء ج ۶ ص ۳۸۸؛ حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۲۲
۲ مراۃ الجنان ج ۲ ص ۱۰، ۳ کتاب الانساب للسمعانی ج ۷ ص ۲۵، ۴ معجم المطبوعات ج ۱ ص ۱۰۴، ۵ کشف الظنون ج ۱ ص ۵۵۶، ۶ بستان المحدثین ص ۳۰، ۷ روض الریاحین ص ۴۲

حاجی خلیفہ لکھتے ہیں کہ "ابن عبداللہ علم الدین جلولی نے اس کو مرتب کیا ہے، اور ایک بڑی جماعت نے اس کی شروح لکھی ہیں، جن میں ابن اثیر الجزری (المتوفی ۶۰۶ھ) کی شرح "کتاب شافی العینی فی شرح مسند الشافعی" پانچ جلدوں میں، علامہ رافعی قزوینی (المتوفی ۶۲۳ھ) کی "الشرح الکبیر" دو جلدوں میں، اور حافظ سیوطی (المتوفی ۹۱۱ھ) کی شرح الشافی العینی علی مسند الشافعی" مشہور ہیں، شیخ زین حلبی نے "المنتخب المرضی فی مسند الشافعی" کے نام سے اس کا انتخاب بھی کیا ہے[۱]۔

دو حدیثیں اور امام شافعی

دوسرے مذاہب پر شافعی مذہب کی برتری پر ائمہ شوافع دو حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں، جن سے اس کی فوقیت ثابت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ امام شافعی کی عظمت اور جلالت شان کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

پہلی حدیث حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ
اللھم اھد قریشاً، فان علم العالم	خدایا قریش کو ہدایت عطا فرما، اس خاندان
منھم یسع طباق الارض، اللھم	کا عالم روئے زمین کو علم سے مالامال کرے
اذقت اولھا نکالاً فاذق	خدایا پہلے تو نے ان پر عذاب نازل کیا، اب
آخرھا نوالاً[۲]	ان پر انعام کی بخشش فرما

اس حدیث کی سند کے متعلق علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ "ھذا رجالہ رجال الصحیح"[۳] عبدالملک بن محمد اس کے مصداق کے متعلق فرماتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول فان عالم العالم منھم یسع طباق الارض" سے مراد ملت کا ایسا قریشی عالم ہے جس کا

۱ کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳۴ ۲ البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۵۲؛ مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹۴
۳ توالی التاسیس ص ۴۷۔

علم پوری دنیا میں پھیل جائے، اور اس کی تالیفات مصاحف کی طرح لکھی جائیں، اور اس کے اقوال زبان زد خلائق ہوں، ہم کو امام شافعی کے سوا کسی ایسے شخص کا پتہ نہیں ملتا جو مذکورہ صفات کا حامل ہو[1]۔

ابونعیم جرجانی فرماتے ہیں کہ "قریشی صحابہ اور تابعین میں سے ہر اہل علم کا علم اگرچہ بہت پھیلا لیکن اس کی شہرت، کثرت اور اشاعت پورے ربع مسکون میں اتنی نہ ہو سکی جتنی امام شافعی کے علوم کی، اس لیے غالب گمان یہی ہے کہ اس حدیث کے مصداق امام صاحب ہی ہیں[2]۔

اور اس میں شک نہیں کہ امام شافعی کے علوم اور مذہب کو جو فروغ حاصل ہوا اس کی مثال حنفی مذہب کے سوا نہیں مل سکتی، عالم اسلام کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں اس مذہب کا کوئی مدرس، مفتی یا مصنف موجود نہ ہو، امام احمد فرماتے ہیں:-

اذا سئلت عن مسئلة لا اعرف فيها خبرا قلت فيها بقول الشافعي لانه امام عالم من قريش[3]	جب بھی مجھ سے کوئی ایسا مسئلہ دریافت کیا گیا جس میں مجھے کوئی حدیث نہ ملی تو میں نے امام شافعی کے قول کے مطابق فتوی دیدیا کیونکہ وہ "امام عالم قریشی" تھے۔

دوسری حدیث تجدید دین سے متعلق ہے، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان الله يبعث لهذه الامة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها	بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے آخر میں اس امت کے لیے ایک ایسے شخص کو مبعوث کرتا ہے جو اس کے دین کی تجدید کرتا ہے۔

۱ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۷۰ ۲ توالی التاسیس ص ۴۰ ۳ ایضاً ص ۴۸

اس حدیث کو ابوداؤد نے اپنی سنن اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا ہے، شیخ علی متقی نے بھی بیہقی کی معرفة السنن والآثار کے حوالہ سے اس کو نقل کیا ہے[1]، اور ملا علی قاری نے اس کی سند کو صحیح اور اس کے کل رواۃ کو ثقہ قرار دیا ہے[2]۔

جس طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے متعلق امت کا اجماع ہے کہ وہ پہلی صدی کے مجدد ہیں، اسی طرح باتفاق محققین دوسری صدی کے مجدد امام شافعی ہیں، انھوں نے بدعات کا قلع قمع کر کے سنت کا بول بالا کیا اور پوری زمین کو قال اللہ وقال الرسول کے ترانوں سے معمور کر دیا،

امام احمد بن حنبل اس حدیث کو مختلف طرق سے روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ہم نے غور کیا تو دیکھا کہ پہلی صدی کے مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں اور دوسری صدی کے امام شافعی اور دونوں خاندان رسول (یعنی قریش) سے بھی ہیں[3]۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ساتویں صدی تک کے تمام مجددین شافعی المذہب تھے[4]۔

تشیع کا الزام

امام شافعی پر تشیع کا الزام بھی لگایا گیا ہے[5] اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ آپ آل رسول سے محبت رکھتے تھے،

ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ امام شافعی سے کہا گیا کہ آپ میں تشیع کا رجحان پایا جاتا ہے، فرمایا کیسے؟ کہا گیا کہ آپ آل رسول کی محبت کا اظہار کرتے ہیں، آپ نے جواب دیا، لوگو! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد نہیں فرمایا کہ

لا يؤمن احدكم حتى اكون احب اليه من والده وولده والناس اجمعين	تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے والد، اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں[6]،

۱ کنز العمال ج ۶ ص ۸۳۰ ۲ مرقات المفاتیح ج ۱ ص ۸۴۲ ۳ مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹۵ ۴ توالی التاسیس ص ۴۸ معجم الادباء ج ۶ ص ۳۸۹ سیرت عمر بن عبدالعزیز لابن جوزی ص ۷۰ ۵ مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹۵ ۶ الفہرست لابن ندیم ص ۲۴۹ و روضات الجنات ج ۴ ص ۱۵۵

نیز ارشاد گرامی "ان اولیائی من عترتی المتقون" کہ جب مجھ پر اپنے متقین اقربا، واعزہ سے محبت کرنا لازم ہے تو کیا یہ بات دین میں سے نہیں ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متقین اقربا سے محبت کروں کیونکہ آپ بھی ان سے محبت فرمایا کرتے تھے ۔

ان کان رفضا حب آل محمد فلیشھد الثقلان انی رافضی[1]

اگر آل بیت کی محبت ہی کا نام رفض ہے تو اے ثقلان تم گواہ رہو کہ میں رافضی ہوں،

ایک شخص نے امام احمد بن حنبل سے کہا، "اے ابو عبداللہ، یحییٰ بن معین اور ابو عبیدہ امام شافعی کی طرف تشیع کا انتساب کرتے ہیں،" امام صاحب نے جواب دیا کہ وہ "کیسی بات کرتے ہیں، بخدا مجھے امام شافعی سے بھلائی ہی کی امید ہے، پھر ہم نشینوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "جب کسی اہل علم کو حق تعالیٰ بلند مرتبہ عطا فرما دیتا ہے اور اس کے معاصرین و ہم عمر اس سے محروم رہتے ہیں تو وہ اس پر رشک وحسد کرتے ہیں اور بے بنیاد الزامات لگاتے ہیں، اہل علم میں یہ کتنی بری خصلت ہے"[2]۔

امام شافعی کی تردید اور امام احمد کے مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ تشیع کا الزام معاصرانہ رشک وحسد کا نتیجہ ہے ۔

---

[1] الاستغفار لابن عبدالبر ص ۹۱ [2] مناقب الامام الشافعی للرازی ص ۳۰

اردو کے چند ابتدائی ساقی نامے

از جناب عبدالرزاق صاحب قریشی رفیق انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی

فارسی شاعری کی طرح اردو شاعری میں بھی ابتدا ہی سے شراب، ساقی اور مطرب کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ (م ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۱ء) نے عید، نوروز، برسات وغیرہ پر جو نظمیں لکھی ہیں اُن میں ساقی، شراب اور مطرب کو بھی یاد کیا ہے۔ مثلاً عید آئی تو شاعر کے یہاں "مدخانۂ عشرت" کھل گیا:

روزیاں کا عید آیا ہے بہو چاؤ ہور بہوماں سوں ساقی پلا مد عیش کا اپ حسن کا پرماں سوں
(بہت / اور / شراب / اپنے)

مدخانۂ عشرت کا کھلیا بہتا پون آنند کا خوش بھید ہے ل پیونا مد جیو کے جاناں سوں

نوروز کی آمد پر شاعر نے اپنی مسرت کا اظہار یوں کیا ہے:

سُرنگ پھول پیالے شبنم سوں دھولاے بھر گلالی تس سبزرنگی نہالاں نورنگیاں بہت سے پلایا ہے

موا میداں کے انند پھول چمن من میں کھلے ہیں گھنگھروال بال پیالے مٹے مدبھر کے پلاوے
(میری / ہیں)

برسات کے آنے پر شادی وطرب کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:

پلا ساقی مے ہور خوشی سیتی ناچ ہوا سبز وخرم ہوا جیسا باچ

خوشی شادی سیتیں ہمن بزم میں صراحیاں اُپر ساقی پیالاں کو راج

معانی علی دم بھٹے خوش ہے ہوا کہو مطرباں کوں بجاؤ کماچ

بعض نظموں کی ردیف ہی "ساقی" ہے۔ مثلاً ایک نظم کے چند منتخب اشعار یہ ہیں:

آیا ہے عید کا چند پھر چرخ بام ساقی لیایا ہے آج کی رنس خوشیاں پیام ساقی

عشرت منجے دلا اب جوں خضر جم جلا اب پیالے بدن پلا اب آیا ہنگام ساقی

متوال سب ملے ہیں جوں پھل چمن کھلے ہیں اپ من منے ہے ہیں بھر بھر دے جام ساقی

پیالے پیتے پلاتے بھر بھر صراحیاں لیاتے مد پی ہوئے ہیں ماتے مستاں تمام ساقی

کھلائے ہیں پھل چمن سب رنگیں ہوئے ہیں تن سب مد جام دے ہمن سب بھر بھر مدام ساقی

سلطان محمد قلی قطب شاہ اور دوسرے قدیم شعراء کے یہاں جو چند بکھرے ہوئے اشعار شراب کی تعریف میں پائے جاتے ہیں وہ درحقیقت قدیم عربی و فارسی شعراء کی مدح خمر کی طرح محض ضمناً ہیں۔ فارسی مثنویات کے زیر اثر اردو مثنویوں میں بھی تقریباً ہر منظر کے شروع میں یا کبھی آخر میں اور شاذ و نادر شروع اور آخر دونوں جگہ ایک، دو یا کبھی کبھی زیادہ اشعار میں ساقی و مغنی کو مخاطب کیا جانے لگا۔ قدماء کے یہاں یہ طریقہ بہت کم ملتا ہے۔ دور متوسطین کے شعرا اور خصوصاً شعرائے دہلی پر چونکہ فارسی کا اثر زیادہ تھا اس لیے ان کے یہاں اس کا چلن زیادہ ہوا۔ لیکن ان اشعار کی حیثیت بھی ضمنی ہے۔

اردو میں سب سے پہلا ساقی نامہ جو ساقی نامہ کے تمام شرائط کو پورا کرتا ہے، جہاں تک مضمون نگار کا علم ہے، محمد فقیہ دردمند (م ۱۱۷۶ھ/ ۶۳-۱۷۶۲ء) شاگرد میرزا مظہرؒ نے لکھا مگر یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ ساقی نامہ کس سنہ میں لکھا گیا۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ یہ ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں یا اس سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ اس میں چند اشعار انھوں نے اپنے استاد اور پیر و مرشد میرزا مظہرؒ کی مدح میں کہے تھے۔ اُن میں سے ایک شعر یہ ہے:

کوئی آج اس کے برابر نہیں وہ سب کچھ ہے الا پیمبر نہیں

عبد الحئی تاباں (م مابین ۶۵-۱۱۶۱ھ/ ۵۲-۱۷۴۷ء) نے اپنے استاد حشمت (م ۱۱۶۱ھ/ ۴۸-۱۷۴۷ء) اور اپنے مربی عمدۃ الملک امیر خاں انجام (م ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء) کی مدح میں ایک مثنوی کہی تھی۔ اس میں

انھوں نے دردمند کا مذکورۂ بالا شعر اپنے استاد کی مدح میں نقل کیا ہے۔ عمدۃ الملک ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں قتل ہوا۔ اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ دردمند کا ساقی نامہ ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں یا اس سے قبل لکھا جا چکا تھا۔

دردمند کا ساقی نامہ ۱۹۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ شیخ چاند مرحوم نے تین نسخوں سے مقابلہ کر کے اسے مرتب کیا اور وہ رسالۂ اردو (اورنگ آباد) جلد ۱۴، نمبر ۳ (جولائی ۱۹۳۴ء) میں شائع ہوا۔ دردمند نے قدیم ساقی نامہ گو شعرا مثلاً ظہوری ترشیزی، نوعی خبوشانی وغیرہ کی تقلید میں اپنے ساقی نامہ میں ذیلی سرخیاں قائم کی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

حمد، نعت، مناجات، مدح میرزا مظہر، مدح محمد علی خاں، خطاب بہ ساقی، قسمیہ، فخریہ، حکایت بر سبیل تمثیل، خطاب بہ زاہد، در تعریف اہل چمن، در اشتیاق گویہ، در ذوق راگ

اگرچہ یہ اردو میں اپنی قسم کی پہلی کوشش تھی لیکن کامیاب کوشش تھی۔ تذکرہ نگاروں نے اس کی بڑی تعریف کی ہے، خود دردمند کے استاد میرزا مظہرؒ کو یہ ساقی نامہ بہت پسند تھا اور وہ اکثر اسے سنا کرتے تھے۔[۱] میرزا صاحب کی سخن فہمی و نکتہ سنجی مسلّم ہے۔ ان کی پسند بجائے خود ایک سند تھی۔ اس میں ساقی نامہ کی ضروری خصوصیات یعنی صفائی و روانی، جوش و مستی وغیرہ مکمل طور پر پائی جاتی ہیں۔ شیخ چاند نے صحیح کہا ہے کہ "دوسو سال قبل کی زبان ہے ...... لیکن جو نمکینی اور صفائی اس کی زبان میں اور جو سلاست و پختگی اس کے طرز ادا میں پائی جاتی ہے اس سے آج بھی ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔"[۲]

نامناسب نہ ہوگا اگر اردو کے اس پہلے ساقی نامہ کے چند اقتباسات یہاں دیے جائیں۔ ساقی کو مخاطب کر کے شاعر اس کی بے رخی کی شکایت کرتا ہے:

---

[۱] مولوی نعیم اللہ بہرائچی، بشارت مظہریہ (قلمی) عکسی نسخہ، برٹش میوزیم، لندن، ق ۱۲۲
[۲] شیخ چاند، "ساقی نامۂ دردمند" رسالۂ اردو، جلد ۱۴، نمبر ۳، ص ۵۸۲

لے ساقی، اے جانِ فصلِ بہار — یہی تھا ہمارا تمہارا اقرار ؟

ہمارے بسرنے کی یہ فصل ہے ؟ — فراموش کرنے کی یہ فصل ہے ؟

تامل سے ٹک دیکھ گل کا شکوہ — کہ لبریز ہے باغ تا دشت وکوہ

اس آتش سے میرا نہ کر دل کباب — نہ کر میری طاقت کے زہرہ کو آب

کہ میں جاں بلب ہوں پیالے کی طرح — لگی ہے مجھے آگ لالے کی طرح

بہت کچھ شکوہ و شکایت کرنے کے بعد وہ ساقی کو قسمیں دے کر کہتا ہے :

تجھے جام صہبا کے سر کی قسم — تجھے اپنے مینا کے سر کی قسم

تجھے جان گل کے لہو کی قسم — تجھے باغ کے رنگ و بو کی قسم

تجھے جام کے چشم تر کی قسم — تجھے اپنی پنہاں نظر کی قسم

اٹھا خاک سے پُر خماروں کے تئیں — جلا ان تغافل کے ماروں کے تئیں

کسی کا ستانا تجھے خوب نئیں — خصوصاً جلانا مجھے خوب نئیں

اس کے بعد وہ "اہل چمن" کی تعریف کرتا ہے اور فصل گل کی شان، شگوفوں کی مستی، گلوں کا جوش، صبا کی تند رفتاری، پانی کی مستی وغیرہ سے حسن تعلیل پیدا کرتا ہے :

مبارک ہوا مے کشاں فصلِ گل — دکھانے لگی اپنی شان فصلِ گل

نظر تم کرو ٹک چمن کی طرف — شگوفے کو مستی سے آیا ہے کف

زبس گرم ہے جوش گل سے ہوا — نہالوں کو پنکھا کرے ہے صبا

ہوا کے نشے نے کیا بس کہ زور — پڑا آب کرتا ہے مستی میں شور

یہ دل کش، ہوش ربا اور نشہ آور منظر دیکھ کر شاعر اپنے دل کا اشتیاق اور درد کا اظہار کرتا ہے اور ساتھ ہی دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے :

ارے ظالمو مفت ہے یہ بہار — کہاں یہ نشہ پھر کہاں یہ خمار

کہ جیوں نقش بر آب ہے یہ جہاں — ٹک یک موج میں تم کہاں ہم کہاں

اولٹ جائیگا ایک دم میں ورق — کروگے سبھی جیوں قلم سینہ شق

نہ یہ مے، نہ یہ باغ رہ جائے گا — نہ ملنے کا یہ داغ رہ جائے گا

کوئی درد اس دکھ سے بدتر نہیں — کہ سب ٹھاٹھ ہے، تم میسر نہیں

جو ہو جائیگا باغ بے آب و تاب — کوئی پی کے تب کیا کریگا شراب

ساقی سے دردِ دل، بیقراریٔ ہجر، بیتابیٔ شوق، ذوقِ صہبا، وغیرہ کے اظہار کے بعد شاعر مطرب سے اپنی تشنگیٔ راگ کا اظہار کرتا ہے :

ارے مطرب، اے دردمندوں کی جان — کبھی تو کہا اپنے والوں کا مان

مجھے اب تلک ذوق صہبا سے تھا — جو کچھ کام تھا جام و مینا سے تھا

ہوا سیر دل اب مئے ناب سے — گیا ہوں گذر عالم آب سے

لگی ہے مجھے پیاس اب آگ کی — گلوگیر ہے تشنگی راگ کی

دردمند کا یہ ساقی نامہ بہت مقبول ہوا، مختلف تذکرہ نگاروں کی تعریف و توصیف کے علاوہ اس کی مقبولیت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ دردمند کے ایک ہم عصر ممتاز شاعر سید عبدالولی عزلت (م ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء) نے اس کے جواب میں ۳۳۱ اشعار کا ساقی نامہ لکھا۔ لیکن تاریخی اعتبار سے اس سے پہلے تاباں اور شاہ حاتم کے ساقی ناموں کا ذکر ضروری ہے۔

تاباں نے اپنے استاد حشمت اور مربی عمدۃ الملک کی مدح میں جو مثنوی کہی ہے اس میں ساقی کو مخاطب کر کے بھی اشعار کہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے مثنوی شروع کی تھی کہ عمدۃ الملک کا قتل ہو گیا۔ مدحیہ حصہ کا آخری شعر ہے :

الٰہی وہ دنیا میں قائم رہے — سلامت تری طرح دائم رہے

اس کے بعد ساقی سے خطاب ہوتا ہے:

سخن مختصر ساقیٔ مے کشاں — کہاں ہو تو اس وقت، ظالم کہاں؟

یہ خطاب اٹھائیس[۲۸] اشعار میں ہوا ہے۔ اس کے بعد شاعر کہتا ہے

یہ کل ہی کی تو بات سن ساقیا — کہ اک شخص یہاں عمدۃ الملک تھا

اب عمدۃ الملک کا مرثیہ شروع ہوتا ہے اور پھر ساقی سے یوں خطاب ہوتا ہے:

تجھے گر جو منظور دینی ہو مے — تو کئی جام دے لے مجھے پے بہ پے

یہ سلسلہ آخر تک چلا گیا ہے۔ ان اشعار کی تعداد انیس[۱۹] ہے۔ اس طرح پہلے کے اٹھائیس[۲۸] اور آخر کے انیس[۱۹]، کل ملا کر سینتالیس[۴۷] شعر ہوئے۔ تاباں کے یہ اشعار اگرچہ ساقی نامہ کے عنوان کے تحت نہیں کہے گئے، بلکہ مثنوی کا ایک حصہ ہیں، لیکن چونکہ ان میں ساقی نامہ کی بعض خصوصیات پائی جاتی ہیں اس لیے ان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ واضح رہے کہ تاباں نے یہ اشعار درد مند کے ساقی نامہ کو سامنے رکھ کر کہے ہیں،

تاباں نے درد مند کی طرح ابتدا میں فصل بہار کا سماں دکھایا ہے اور دشت وجبل کے سبزۂ وگل کی تصویر کھینچی ہے۔ اس کے بعد ساقی سے مے طلب کی ہے۔ انھوں نے درد مند کی تقلید میں مختلف چیزوں سے حسن تعلیل بھی پیدا کی ہے۔ مثلاً

ہوئی بسکہ فیض نسیم سحر — ہر اک گل کا کیسہ ہے لبریز زر

ہیں اہل چمن آج ساغر بدست — ہے یہاں سلطنت کا اساب بند و بست

کسی بے ادب کا نہ ہوتا گذار — عصا لے کے نرگس ہوئی چوبدار

دکھے گر زیادہ کوئی حد سے پا — تو میر تزک سر دیں جا بجا

آسمان پر کالی گھٹا، جوش باراں، دشت وجبل میں سبزۂ وگل کی فراوانی، شگوفۂ چمن وغیرہ کا دل کش منظر دکھانے کے بعد شاعر اس طرح گریز کرتا ہے:

غرض ہے غنیمت یہ آب ہوا — گر اس وقت ساغر تو دے ساقیا

تو ہو مست لوٹوں چمن کی بہار — کروں تجھ پہ لے لے زر گل نثار

وگرنہ فلک مدعی ہے بڑا — مبادا کہ پھر جائے آب وہوا

اس کے بعد عمدۃ الملک کا مرثیہ ہے۔ پھر شاعر ساقی کو مخاطب کرکے مے کی درخواست کرتا اور وہی فصل بہار کا واسطہ دیتا ہے اور ساتھ ہی فلک کے کینہ اور دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتا ہے۔

تاباں کا انداز بیان ان کے عہد کے مطابق ہے، یعنی ان کے اشعار میں صفائی و روانی ہے۔ جوش بیان بھی جو ساقی نامہ کی امتیازی خصوصیت ہے، ان کے یہاں پایا جاتا ہے۔

شاہ حاتم (م ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۳ء) کا ساقی نامہ جو ساٹھ[۶۰] اشعار پر مشتمل ہے ۱۱۶۱ھ م ۴۸-۱۷۴۷ء میں لکھا گیا۔ اس میں ذیلی سرخیاں نہیں ہیں لیکن ابتدائی اشعار حمد، نعت اور حضرت علیؑ کی منقبت میں ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد گیارہ[۱۱] ہے۔ چند منتخب اشعار نیچے نقل کیے جاتے ہیں:

سن اے ساقیٔ آفتاب جہاں — سن اے قبلہ و کعبۂ مے کشاں

سن اے ابر رحمت سن اے نوبہار — سن اے موسم گل سن اے گل عذار

سن اے ساقیٔ پاک پروردگار — محمد سے مے کا تری جام دار

کہ جس جام میں ہے مئے سرمدی — محمد نے پی جب ہو آیا نبی

علیؑ جس کا ہر وقت میں یار ہو — علیؑ جس کے ساغر کا مخمور رہو

علیؑ ولی پیر ہر مے پرست — وصی نبی جام کوثر بدست

ساقیٔ کوثر سے جام کی درخواست اس طرح ہوتی ہے:

کہ اے ساقیٔ کوثر و جام بخش ۔۔۔ ہمارے نگین و درے نام بخش (؟)

مجھے میکشوں بیچ نامی کرو ۔۔۔ مری بزم کو بزم جامی کرو

پلا مجھکو اپنی محبت کی مے ۔۔۔ کرم سے دو سہ جام دے پے بہ پے

کہ پھر مجھ کو پینے کی حاجت نہ ہو ۔۔۔ کسو غیر سے پھر سماجت نہ ہو

کہ ہو جس کے پینے سے دل کو نجات ۔۔۔ ہر اک بوند ہونگی آبِ حیات

اس درخواست کے بعد شاعر شراب کی تعریف کرتا ہے اور جوش مستی میں پکار اٹھتا ہے:

نہیں محتسب کا ہے اندیشہ آج ۔۔۔ کہ ہم پاس دارو و شیشہ ہے آج

ارے میکشو، آؤ مستی کریں ۔۔۔ کبھو حق، کبھو مے پرستی کریں

اس جوش مستی میں شاعر زاہد کا بھی مذاق اڑاتا ہے اور اس کی ریاکارانہ عبادت سے بےزاری کا اظہار کرتا ہے۔ آخر میں وہ اس شراب کی جو وہ پیتا ہے، یوں تعریف کرتا ہے:

اگر اس کا قطرہ پیو تم کبھو ۔۔۔ مچاؤ ہر اک بزم میں ہاؤ ہو

اگر ظرف ہے تو کرو اسکو نوش ۔۔۔ دل و جاں سے ہو خادم مے فروش

یہ دارو ہے سب درد و غم کی دوا ۔۔۔ اگر ہاتھ آوے تو پی اور پلا

حاتم کے ساقی نامہ میں کسی بادشاہ یا رئیس کی مدح نہیں ہے۔ حضرت علیؓ کی منقبت میں بھی صرف دو شعر ہیں۔ اس میں وہ ظاہری جوش و خروش بھی نہیں پایا جاتا جو ساقی نامہ کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اس کے برعکس اس میں نرمی یا دھیما پن ہے۔ لیکن جذبات کا اخلاص اتنا زیادہ ہے کہ اس کمی کی تلافی کر دیتا ہے۔ اس میں سمندر کا جوش نہیں بلکہ نرم رو، خوش خرام ندی کا حسین اور خوشگوار بہاؤ ہے۔ اس ساقی نامہ کی شراب سرتاسر شرابِ معرفت ہے۔ اس کو پڑھکر نہ

صرف مسرت ہوتی ہے بلکہ عرفان بھی حاصل ہوتا ہے۔

عزلت کا ساقی نامہ[1] جو ۱۳۳ اشعار پر مشتمل ہے ۱۱۸۳ھ/۱۷۶۹ء میں خود عزلت کے بیان کے مطابق ایک دن میں لکھا گیا:

طفیل حق اور چار دہ پاک تن ۔۔۔ کہا ایک دن میں یہ سب سخن

اس کا تاریخی نام "بیان ظہور" ہے۔ ساقی نامہ شروع ہونے سے پہلے مندرجۂ ذیل عبارت ملتی ہے:

"ساقی نامۂ اعجاز شمامہ کہ نام و تاریخش بیان ظہور است از فقیر عزلت عفرلہ اللہ تعالیٰ"

ساقی نامۂ عزلت چونکہ ساقی نامۂ دردمند کو سامنے رکھکر لکھا گیا ہے اس لیے اس کا انداز مجموعی حیثیت سے تقریباً وہی ہے جو ثانی الذکر کا ہے۔ تمہیدی اشعار کے بعد جو حمد و نعت میں ہیں عزلت نے مندرجۂ ذیل عنوانات کے تحت اشعار کہے ہیں:

"تمہید مدح حضرت ولی مدظلہ، کہ مرشد منست و سبب مثنوی گفتن، سوال پروانہ از شمع جواب شمع بر پروانہ، خطاب طعن آمیز بشیخ کہ منکر میکشی است متضمن ترغیب می دادن ساقی را مشتمل بر مطلب خود بساقی، بیان آمد آمد شاہ بہار و جوش جنوں و الفت توام فصل گل در چمن، بیان حکایت اتفاقی سخن در سخن بعضی اہل معنی و اظہار الہامات بی بدل الہی کہ محض بفضلہ تعالیٰ مورد آں شدم و ختم کلام مشتمل بر تاریخ و نام ساقی نامۂ اعجاز شمامہ۔"

حضرت ولی کی خاصی لمبی مدح کے بعد شاعر کے دو شعروں میں اس ساقی نامہ کے لکھنے کا سبب بتایا ہے:

کہا حضرت مرشد ولی نے یوں ۔۔۔ نہیں کہتا ایک ساقی نامہ تو کیوں

---

[1] یہ ساقی نامہ مجلۂ نوائے ادب (بمبئی)، جلد ۱۵، نمبر ۲ (جولائی ۱۹۶۷ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

یہ ارشاد حسن واجب الامتثال کیا مثنوی کہنے کا میں خیال

لیکن یہ سبب شاعرانہ حسن بیان سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا حقیقی سبب یا محرک اس ساقی نامہ کے کہنے کا ساقی نامۂ دردمند ہے۔ صاحب چمنستان شعرا عزلت کے مخلص دوستوں میں سے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ "ساقی نامہ کہ در جواب دردمند گفتہ ......"[1]

اپنے ساقی نامہ کے آخری حصہ میں عزلت نے دردمند سے جو شاعرانہ چھیڑ چھاڑ کی ہے وہ بھی اس کا بین ثبوت ہے۔

عزلت نے دردمند کی طرح ساقی کو مخاطب کر کے شکوہ و شکایت کا دفتر کھولا ہے اور اس سے مے طلب کی ہے:

اے ساقی، نہ ہو تو تغافل شعار ارے کشت مستوں کی ابر بہار
رہوں کب تک آتش سے گل کی کباب جلن یہ بجھانے کو صہبا ہے آب
شراب اپنا صدقہ ارے یار دے سر اپنے پہ ہر جام مے وار دے
بھلا نا مجھے تجھ کو یاد آئے گا مرے بعد مل ہات پچھتائے گا

اپنی درخواست کو پُر زور اور با اثر بنانے کے لیے دردمند کی طرح عزلت نے بھی ساقی کو قسمیں دی ہیں۔ مثلاً

تجھے جام کے سر کے دوراں کی سوں تجھے شیشے کی چشم گریاں کی سوں
تجھے گل کے ہنس ہنس کے ملنے کی سوں تجھے جان بلبل کے جلنے کی سوں
تجھے میرے خون تمنا کی سوں تجھے پُر حنا دست اور پا کی سوں
قسم گلشن میکدہ نام کی قسم سرو مینا، گل جام کی

[1] لچھمی نرائن شفیق، چمنستان شعرا (مرتبہ مولوی عبد الحق)، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو ۱۹۲۸ء، ص ۴۴

تغافل کے شعلے سے میرے چراغ جلا مت تو جوں شمع میرا دماغ

فصل گل کا سماں اور جوش جنون کی کیفیت کی مصوری ساقی نامہ کا ایک اہم جزو ہے۔ عزلت نے اس کی اچھی عکاسی کی ہے۔ مثلاً

اے یار دیہ مفت آئی ہے فصل گل غنیمت ہے سیر گل و جام مل
کس افراط سے آئی فصل بہار کہ ہے ہر کف خاک گل در کنار
چمن سے لے تا کوہ و صحرا ہے گل دلے عینک سیر ہے جام مل
پیالہ بکف پھاڑ دو تم پیرہن ہو مست و کر لیو دلوانہ پن
چلو لے یہ ساماں سوئے گلستاں مے و مطرب و یار و ہم صحبتاں

فصل گل کا جنوں خیز و نشہ آور سماں دکھانے اور مے نوشی کی ترغیب دلانے کے بعد شاعر دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچتا اور مے نوشی کی مزید ترغیب دلاتا ہے، چند منتخب اشعار نیچے نقل کیے جاتے ہیں:

جو دم گذرے گلشن میں ہے مغتنم کہ کر جائے گی فصل گل دم میں رم
چمن میں ہے توام بہار و جنوں شگفتہ ہے ہر گل و لے دل ہے خوں
یہی وحی لایا ہے جبریل گل کہ شق کر گریباں پیو جام مل
پر اشکوں سے ایک چشم ہے تر جہاں پلک مارتے ہم کہاں، تم کہاں
ورق گل کا دم میں الٹ جائے گا خزاں کا ہی صفحہ نظر آئے گا
نہ رہوے گا سنبل نہ بلبل نہ گل نہ مینا نہ ساغر نہ قلقل نہ مل
مگر حسرت ہم نشینیٔ یار خزاں وار چھیدے گی دل، بن کے خار

عزلت حقیقتہً غزل کے شاعر تھے۔ ساقی نامہ انھوں نے دردمند کی تقلید میں یا بابت

ممکن ہے کسی دوست کی فرمائش سے لکھا ہو۔ پھر ۳۳۱ اشعار ایک دن میں کہے۔ اسلیے
اس میں پست و بلند کا ہونا تعجب کی بات نہیں۔ بعض پست بغایت پست ہیں۔ جب
دونوں کے ساقی ناموں کا مقابلہ و موازنہ کیا جاتا ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عزلت کے یہاں
تخیل کی پرواز بلند تر ہے لیکن دردمند کے اظہار بیان میں صفائی، روانی، شگفتگی اور جوش
زیادہ ہے۔ عزلت کے یہاں الفاظ کا شکوہ اور شگفتہ ترکیبوں کا استعمال ہے اور دردمند
کے یہاں سادگی میں پرکاری۔ عزلت کے یہاں تفصیل ہے اور دردمند کے یہاں اختصار۔
عزلت کی زبان میں قدامت دردمند کے مقابلے میں زیادہ جھلکتی ہے، حالانکہ عزلت کا ساقی نامہ
ثانی الذکر کے ساقی نامہ کے تقریباً پندرہ برس بعد کہا گیا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ دردمند
کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہا اور عزلت کی زندگی کا بیشتر حصہ سورت میں گذرا۔

اس دور میں چند اور ساقی نامے لکھے گئے۔ مثلاً حمایت علی مجنوں، حیدر جونپوری،
عشق عظیم آبادی اور میر تقی میر کے ساقی نامے۔ اول الذکر دو کے ساقی ناموں کے
زمانہ کا تعین خصوصاً مشکل ہے کیونکہ خود ان ساقی ناموں کا پتہ نہیں۔ صرف ایک آدھ
تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ مجنوں کے سامنے دردمند
کا ساقی نامہ رہا ہو گا کیونکہ وہ صاحب گلشن سخن کے بیان کے مطابق مرشد آباد میں مقیم تھے
اور ناظم بنگالہ مبارک الدولہ کی فرمائش سے انھوں نے یہ ساقی نامہ لکھا تھا۔[1] دردمند بھی
مرشد آباد میں رہ چکے تھے۔ مذکورہ بالا تذکرہ کے مصنف نے مجنوں کے بارے میں لکھا ہے کہ
"بالفعل از مدتی مقیم مرشد آباد"[2] اس تذکرہ کا سال تصنیف ۱۱۹۴ھ/۱۷۸۰ء ہے۔
اسلیے اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مجنوں کا ساقی نامہ سال مزبور سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔

۱ مردان علی خاں مبتلا لکھنوی، گلشن سخن (مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب) علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ۱۹۶۵ء، ص ۲۱۱
۲ ایضاً

حیدر جونپوری کے ساقی نامہ کی وجہ تالیف شورش عظیم آبادی نے یہ بتائی ہے کہ انھیں (حیدر کو)
کوئی "بیماری لاحق" ہوئی۔ اس لت میں انھوں نے حضرت علیؑ سے رجوع کیا اور ان کی مدح پر
مشتمل یہ ساقی نامہ لکھا اور اپنی مراد کو پہنچے۔[1] افسوس ہے کہ تذکرہ نگار نے اس ساقی نامہ کے صرف
مندرجۂ ذیل دو شعر اپنے تذکرہ کی برکت کی خاطر نقل کیے:

خدا مے، نبی جام، ساقی علی — اسی کا نشہ ہے خفی و جلی
نہ پیر مغاں سا کوئی پیر ہے — نہ ان مغبچوں سا کوئی میر ہے

عشق دہلوی ثم عظیم آبادی (م ۱۳۰۳ھ/۸۹-۱۸۸۸ء) کا ساقی نامہ محفوظ ہے لیکن اس کے
زمانہ کا تعین بھی کسی خارجی ثبوت کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں ۶۴۳ اشعار ہیں۔ ابتدا میں
تو اس کا وہی انداز ہے جو اس سے پہلے کے ساقی ناموں میں پایا جاتا ہے لیکن آگے چل کر کچھ نئی
باتیں بھی ملتی ہیں۔ شاعر نے ساقی کو پہلے اس کی اگلی الفت یاد دلائی ہے۔ پھر اسے قسمیں دی ہیں
اور اس سے جام کی درخواست کی ہے تاکہ اسے پی کر وہ ننگ و نام کے عار سے پاک ہو جائے
اور ساقی کے سوا اس کے دل میں اور کسی کی جگہ نہ رہ جائے، یہاں تک کہ وہ شب و روز
کی قید سے بھی آزاد ہو جائے۔

کرے کر میں اس آتشیں جام کو — جلاؤں میاں ننگ اور نام کو
زباں پر نہ آوے کوئی گفتگو — رہے دل میں میرے نہ کچھ آرزو
سرو کار دل کو نہ ہو تجھ بغیر — کسو سے نہ الفت کسو سے نہ بیر
پلا اس مئے آرزو سوز سے — فراغت ہو مجھ کو شب و روز سے

شاعر کا اضطراب ساقی کو قسمیں دینے پر مجبور کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ غایت محبت میں

۱ کلیم الدین احمد، مرتبہ، دو تذکرے، تذکرۂ شورش مصنفہ شورش عظیم آبادی، پٹنہ البیل لیتھو پریس ۱۹۵۹ء
ص ۲۱۱

ساقی کی تشبیہ لفظوں میں کھینچتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں رعایت لفظی سے بہت کام لیا گیا ہے پھر بھی عشق کی جدت ہے۔ ساقی کی تشبیہ اس سے پہلے کسی اردو ساقی نامہ میں نہیں ملتی۔ دوسری نئی بات اس ساقی نامہ میں یہ ملتی ہے کہ شاعر نے "نکتۂ عشق" بیان کیا ہے۔ مثلاً

زمیں عشق ہے، آسماں عشق ہے — مکیں عشق ہے اور مکاں عشق ہے
بہار و خزاں عشق کے رنگ ہیں — خمار و نشہ عشق کے ڈھنگ ہیں
وجود اور عدم عشق کے نام ہیں — حدوث اور قدم عشق کے نام ہیں
اگر قلب پر عشق ہو جلوہ گر — حقیقت تجھے دم میں آوے نظر

نکتۂ عشق بیان کرنے کے بعد شاعر ساقی کو مخاطب کر کے عشق کی اہمیت جتاتا ہے:

اگر عشق پیدا نہ کرتا نیاز — تو کرتا بھلا کس پہ اب حسن ناز
اگر عشق سر سے بچھاتا نہ خاک — تو رکھتا قدم کس طرح حسن پاک
غرض عشق سے حسن کو آب ہے — اگرچہ میاں عشق بیتاب ہے

دوسرے شعرا کی طرح عشق نے بھی شکایت کا دفتر کھولا ہے لیکن شکوہ کے ساتھ ساتھ انھوں نے تشکر کا بھی اظہار کیا ہے کیونکہ ساقی نے انھیں "لذت درد کا مبتلا" کیا اور، اسی کی بدولت وہ "نام اور راز عشق" سمجھنے لگے اور اسی کے فیض سے وہ "سوز اور ساز عشق" کے رمز شناس ہوئے۔ اسی سلسلہ میں انھوں نے حقیقت دل بھی بتائی ہے اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

اگر دل نہ ہوتا نہ ہوتا جہاں — کہ جز دل کے گھر عشق کو تھا کہاں

حاتم کی طرح عشق نے بھی زاہد کی خبر لی ہے اور اسے اپنی شراب (معرفت) کی خصوصیات بتائی ہیں۔ مثلاً

یہ مے ہے جو آتش و آب ہے — جہاں کے لیے آب اور تاب ہے

شرابا طہورا اسے کہتے ہیں — اسے پی کے آرام سے رہتے ہیں
اسی مے کا ہے نام آب حیات — یہی ذات ہے اور یہی ہے صفات

فصل بہار کے ذکر سے کوئی ساقی نامہ خالی نہیں رہ سکتا عشق نے بھی داستان گل سنائی اور مے نوشی کی ترغیب دلائی ہے ساتھ ہی دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا ہے جو ساقی نامہ کی ایک دوسری اہم شرط ہے۔ عشق کی فصل گل میں وہ دلکشی و رنگینی نہیں جو دردمند یا عزلت کے یہاں پائی جاتی ہے۔ انھوں نے رعایت لفظی سے زیادہ کام لیا ہے اسلیے انکی بہار کچھ مصنوعی سی معلوم ہوتی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کے سلسلہ میں بھی انھوں نے ایک لفظ "دم" کا استعمال مسلسل انیس [۱۹] شعروں میں کیا ہے۔ پہلا شعر یہ ہے:

گئے دم بھلا پھر کہیں آتے ہیں — یہ دم ہیں جو اب دمبدم جاتے ہیں

آخری شعر:

چلو جلد ساقی سے مانگیں جو جام — دم گرم سے اس کے ہووے نظام

عشق کے ساقی نامہ میں ظاہری جوش و خروش کچھ کم ہے لیکن محبت کا طوفان شدید ہے۔ حاتم کے ساقی نامہ کی طرح اس ساقی نامہ کو بھی پڑھ کر مسرت کے ساتھ ساتھ عرفان حاصل ہوتا ہے۔ اگر شاعر نے ایجاز سے کام لیا ہوتا اور رعایت لفظی سے گریز کیا ہوتا تو یہ اور زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتا تھا۔

میر تقی میر (م ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء) بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں جس میں شاہ حاتم، سودا، دردمند وغیرہ تھے۔ اسلیے ان کے ساقی نامہ کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان کے ساقی نامہ میں کل ۱۰۷ اشعار ہیں۔ ان میں سات شعر کی ایک غزل بھی ہے اور آخر میں مقولہ شاعر کے تحت پانچ شعر ہیں۔

میر کے ساقی نامہ کے ابتدائی اٹھارہ [۱۸] شعر حمد میں ہیں۔ ساقی نامہ کی مناسبت سے ان اشعار میں بھی جام و مینا کا عکس پایا جاتا ہے۔ حمد کے بعد شاعر کا روئے سخن چمن کی طرف ہوتا ہے اور "بہار میگساراں" کے وصف میں اشعار سرائی ہوتی ہے اور ساقی سے جام طلب ہوتا ہے:

ظالم مئے ناب دے، ہوا ہے — اک جرعۂ شراب دے، ہوا ہے
اطراف چمن کھلا ہے لالہ — ہر پھول شراب کا ہے پیالہ

ابر سیاہ کی مستی، بوندوں کا جھمکا، نسیم کی تحریک، سرو جوان کا نشہ شاعر کو بیتاب کر دیتا ہے اور وہ ساقی سے دوبارہ جام کی درخواست کرتا ہے۔ اس بار وہ مطرب کو بھی یاد کرتا ہے:

ساقی قدحے کہ ذوق مل ہے — مطرب غزلے کہ فصل گل ہے

اس کے بعد سات شعر کی ایک غزل ہے۔ ساقی نامہ میں غزل سرائی کرنا، اردو کی حد تک میر کی جدت ہے۔ فارسی میں اس کی ابتدا ظہوری نے کی تھی۔ میر کی غزل کے اشعار ساقی نامہ کی مناسبت سے ہیں۔ مثلاً

قربان پیالۂ ناب — جس سے کہ ترا حجاب نکلا
تھا غیرت بادہ عکس گل سے — جس جوئے چمن سے آب نکلا

میر نے شراب کی تعریف میں اٹھارہ شعر کہے ہیں۔ لیکن ان کی شراب تند نہیں ہے۔ پھر بھی چند شعروں میں میر کے سوز دروں کی چنگاریاں موجود ہیں۔ مثلاً

سرمایۂ عمر جاودانی — یعنی ہے وہ آب زندگانی
وہ سرخی چشم خوبرویاں — اسباب خرابی نکویاں

میر کا ساقی نامہ پچھلے ساقی ناموں کی ٹکر کو نہیں پہنچتا۔ اس میں ساقی نامہ کے تمام شرائط بھی نہیں پائے جاتے۔ البتہ سارے ساقی ناموں پر میر کے مخصوص رنگ تغزل کی چھاپ ملتی ہے۔

اردو کے ان ساقی ناموں کا مجموعی حیثیت سے وہی انداز ہے جو فارسی کے قدیم ساقی ناموں میں پایا جاتا ہے۔ بحر بھی ان شعرا نے (باستثنائے میر) وہی استعمال کی ہے جو فارسی کے ساقی ناموں میں عموماً استعمال ہوئی ہے۔ یعنی بحر متقارب مثمن مقصور۔ ذیلی سرخیاں بعض شعرا نے استعمال کی ہیں اور بعض نے نہیں لیکن مغنی سے خطاب صرف درد مند کے ساقی نامہ میں ملتا ہے۔ دوسروں کے یہاں صرف ضمناً کسی کسی شعر میں خطاب ہو گیا ہے۔ ان ابتدائی ساقی ناموں میں ساقی نامۂ درد مند کو جہاں اولیت کا شرف حاصل ہے وہیں ہر حیثیت سے مکمل ساقی نامہ کہلانے کا بھی وہی مستحق ہے۔

عظمت اللہ بے خبر کا رسالۂ غبار خاطر

از

جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب صدر شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی حیدرآباد

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنے مکاتیب "غبار خاطر" کا نام میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی کے رسالۂ غبار خاطر سے مستعار لیا تھا۔ اس کا اعتراف انھوں نے اس مجموعے کے دیباچے میں اس طرح کیا ہے:-

"میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی، مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے معاصر اور ہم وطن تھے اور جدی رشتے سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ آزاد بلگرامی نے اپنے تذکروں میں جا بجا ان کا ترجمہ لکھا ہے اور سراج الدین علی خاں آرزو اور آنند رام مخلص کی تحریرات میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے ایک مختصر رسالہ غبار خاطر کے نام سے لکھا تھا۔ میں یہ نام ان سے مستعار لیتا ہوں۔

م پرس تا چہ نوشت ست کلک قاصر ما — خط غبار من ست ایں غبار خاطر ما"

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے سرو آزاد[1] میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۳۴ھ میں میر عظمت اللہ بے خبر کے

[1] سرو آزاد (حیدرآباد دکن ۱۹۱۳ء) ص ۳۱۵ بعد۔ اسی میں بے خبر کے والد کو سید العارفین سید لطف اللہ بلگرامی کہا گیا ہے۔ اور سفینۂ خوشگو (دفتر ثالث) مرتبہ عطاء الرحمن صاحب (پٹنہ ۱۹۵۹ء) ص ۱۷۲-۱۷۵ میں بے خبر کے والد کا نام لطف اللہ احمدی المعروف شاہ لدھا) ہے جن کا سال وفات ۱۱۴۳ھ (ص ۱۷۵) بھی دیا ہے۔ لیکن سرو آزاد (صفحہ ۳۳۲) میں احمدی کا نام سید احمد بلگرامی ملتا ہے اور یہ کہ وہ اپنے چچا سید العارفین کے مرید تھے۔ پھر ان کا سال وفات (ص ۳۳۳) ۱۱۶۱ھ بھی دیا ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ سید العارفین اور احمدی دو مختلف شخص تھے۔

ساتھ بلگرام سے دہلی تک گئے تھے۔ اور ان کے تذکرۂ سفینۂ بے خبر کا ایک اقتباس بھی دیا ہے جس میں بے خبر اور میرزا بیدل کی ملاقات کا ذکر ہے۔ پھر ان کے کلیات میں سے (جس میں قریب سات ہزار اشعار تھے) ایک انتخاب بھی دیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ وہ دوشنبہ ۲۴ ذی قعدہ ۱۱۴۲ھ کو دہلی میں فوت ہوئے اور حضرت سلطان المشائخ نظام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے قریب دفن ہوئے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے ان کے انتقال پر بارہ اشعار کا ایک "قصیدہ" لکھا تھا جس کے ہر مصرع سے بے خبر کا سال وفات برآمد ہوتا ہے۔ ابتدائی تین اشعار یہ ہیں:

۱۱۴۲ھ - می زند جوشِ تلاطم باز عمانِ الم — اشک می ریزد بروی لوح مژگانِ قلم ۱۱۴۲ھ

صفحۂ احوال ماتم سینۂ مجروح گل — سنبلِ زلفِ بیان جعدِ پریشانِ صنم

طائر آسودگی در سیر پرواز فنا — آہوئے ہامونِ طاقت برقِ مہمیزِ عدم

مولانا ابوالکلام آزاد نے میر عظمت اللہ بے خبر کے رسالے سے اپنے مجموعۂ مکاتیب کا نام کیوں مستعار لیا؟ اس کا سبب وہی بتا سکتے تھے، یہاں صرف اس رسالے کو پیش کرنا مقصود ہے کیونکہ وہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ راقم الحروف کے پاس مرزا جان طپش کی ایک بیاض[1] ہے جس میں بعض نادر رسالے بھی درج ہیں۔ ان ہی میں عظمت اللہ بے خبر کا رسالہ بھی ہے۔ رسالے کا مضمون کچھ ایسا ہے کہ راقم الحروف اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ البتہ اس میں ابوالفضل عباس بن یوسف الشکلی (المتوفی ۳۱۴ھ) کا ایک قول درج ہے جو طبقات الصوفیہ[2] (امالی خواجہ عبداللہ انصاری ہرویؒ) میں کسی قدر مختلف ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ

"وی گفت:- ہر کہ باللہ مشغول، از ایمانِ او بر نواید رسید و ہر کہ از اللہ مشغول از نفاق او بر نیاید رسید"

---

[1] عزیز گرامی نجم الاسلام صاحب نے رسالۂ نقوش (لاہور، ستمبر ۱۹۶۷ء) میں اس بیاض پر مفصل بحث کی ہے۔

[2] طبقات الصوفیہ۔ مرتبہ محترم عبدالحیٔ حبیبی۔ کابل ۱۹۶۲ء۔ ص ۱۲۰

محترم عبدالحیٔ حبیبی نے اس پر حاشیہ اس طرح لکھا ہے:-

"جامی چنین آوردہ، ہر کہ بحضرت حق سبحانہ مشغول است از ایمان وی نباید پرسید۔ اصل قول عباس شکلی بروایت سمعانی چنین است: اذا رأیت الرجل مشتغلا باللہ فلا تسئل عن ایمانہ واذا رأیتہ مشتغلاً عن اللہ فلا تسئل عن نفاقہ (الانساب، ۳۳۰ ب)

در ترجمۂ فارسی آن در ہر سہ نسخہ بجای (پرسید) جامی (رسید) است پس بر نواید رسید یعنی رسیدگی و تفحص نباید کرد و نباید پرسید ......"

اب اصل رسالہ پیش کیا جاتا ہے جس پر مرزا جان طپش نے لکھا ہے کہ بے خبر نے وہ رسالہ اپنے صاحبزادے[1] کے لیے لکھا تھا:-

رسالہ میر عظمت اللہ بیخبر تخلص مسمی بغبار خاطر کہ بہ پسر نوشتہ

بپرس تا چہ نوشتست کلکِ قاصرِ ما — خطِ غبار رقمست ہم غبارِ خاطرِ ما

ستایشِ حضرت حق سبحانہ تعالیٰ بالاتر ازین نیست کہ وجودش واجب و مبداء است و نعت محمد مصطفیٰ بیش ازین نخواہد بود کہ ذاتش مظہر اتم و خاتم الانبیاء ست صلی اللہ علیہ وسلم۔ بعد ہذا بسنندانِ طلبِ الٰہی مخفی نماند کہ در دیشے حال تباہ بے کمالات دستگاہے اشنا رائے باین حسرت مایہ در خور دو کلمہ چند مخاطب خود گردانید و آن اینست کہ میگفت بنی نوع انسان را، نظر بر اعتقادات مختلف ایشان، چندین صنف ہاست کہ ہر یک بر دین و آئینِ خود مستقل اند۔ قول دیگرے را معتبر نمیدانند بلکہ باہم آنقدر مباحثہ و مجادلہ دارند کہ اگر از مقدمات دنیوی شایبہ نباشد کشتن یکدیگر را ثواب میدانند۔ پس آنکس کہ معتقدش ہیچ یکے ازین ادیان بغیر شوب حقیت او نبود چکند۔ مثلاً اگر

---

[1] بیخبر کے دو صاحبزادے تھے (۱) میر نوازش علی فقیر (المتوفی ۱۱۶۷ھ) (۲) سید کرم اللہ غریب (المتوفی ۱۱۶۹ھ) دیکھیں سرو آزاد، ص ۳۲۵ - ۳۲۷۔ بے خبر کے ایک شاگرد عبدالواحد واحد ذوقی (المتوفی ۱۱۳۴ھ) تھے۔ (ایضاً ص ۳۴)

کفر را برگزیند اسلام از وچہ کم دارد، اگر آنجا دیر ست اینجا کعبہ است، و گر آنجا خرقِ عادت است اینجا معجزہ و کرامت، علیٰ ہذا القیاس ہمہ مذاہب باہم ہمچنیں اند کہ ہیچ یکے از دیگرے نقصانے ندارد و سوائے ایں دلیل حقیقتِ خود ہا را ہم نمی شایند چہ کعبہ و دیر را دیدے کہ در آنہا چہ چیز است

دل بہ دیر و کعبہ نادانستہ بستم بیخبر — حیف برایں سنگ ہا بیجا شکستم شیشہ

خرقِ عادت و معجزہ را شنیدے کہ اختیاری نبودند بلکہ کرامت از ہر انسان در وقتی ظاہر شدہ میشود بلکہ بعضے مردم را نسبت ..... لباس امتیازی ہست کہ آنہا مظہر کمالاتِ انسانی بیشتر اند، اما اعتقاد اگر در حقیقت سیدہ بخدا باشد و علم قدرت الہی در احاطہ کسب مختلف ایشاں در آمدہ باشد خالی از خیال نیست

ہر چہ در دل بگذرد و غیر از خیالے بیش نیست — نکتہ رنگینست گر انہم بہ خاطر بگذرد

ہر خار سیدہ را دیدے و شنیدے کہ عجزے بحال خود داشتند اختراع من وقت کہ آنہا را ہمچنیں و آنچناں پنداشتیم و آنہا ہم بغفلتِ نفسانی نسبت بما خود را ممتاز دانستند و الا چہ کمال دارند وچہ حاصل کردند ے

اشک پرورشے کہ پنہاں جوہر دل شد چہ شد — نالہ سردادے کہ انہم حلِ مشکل شد چہ شد
خوں شدم ز اندیشۂ انجام کارِ خویشتن — کاینہمہ دنیا و دیں گر ہست حاصل شد چہ شد
دامن پاکت بخون ہیچ صید آلودہ نیست — عالمے گر بر سر کوی تو بسمل شد چہ شد

مگر عمر خود را خواہ نعیم خواہ بعیش بسر بردند و در تلون زمانہ ..... و مدام بخورش و پوشش محتاج بودند از ہمہ چیز تواں گذشت اما از لقمۂ نان نمی تواں گذاشت در عدم محتاج نبودے اما در وجود محتاج بقوت شدے

ذکرِ جاناں بر نمی آید ز فکرِ نانِ ما — جانِ ما و دل سلامت بعد ازیں جانانِ ما

بالحاصل ہر صاحب کمال کہ وارسی در راہ حق سبحانہ ناقص است ے

ہزاراں جاں فدا ای احمد پاک — کہ میگوید کماہی ما عرفناک

آرے

دور بیناں بارگاہ الست — بیش ازیں رہ نبردہ اند کہ ہست

ہمیں عرفان ست کہ معراج ہمہ عارفاں امم مختلفہ است۔ اگر ترا تشنگی باشد خالصاً در راہ خدا بیافت و تماشای معاملات و مشاہدات مغریب ے

ہر قدم مژگان گیر است خار این طریق — مردے باید کزیں وادی سلامت بگذرد

آں زماں بہ بیں کہ چہ می بینی و دریاب کہ چہ می یابی۔ ہر گاہ کمال تو غیر از علم ہستیش صورت نبست پس آں اقوال و افعال تو ناسخ اقوال و افعال ہیچ توئی را خطورہ تو اندشد مگر مصلحۃ در بعضے امور آنہم موقوف بر تجویز و تمیز بعضے واز تو داو ست و آں خود اشکال تمام دارد چہ ہر کسے گرفتار طرف خود است اگر از طرف خود برآید بطرف دیگر خواہد رفت۔ نمیشود کہ شش جہتش یکساں باشد۔ ایں شنیدی دیگر بشنو کہ آنہمہ اظہار کمالات تو فرض کردم کہ راست است در ہمیں نوع انسانے خواہد بود و انواع دیگر را چہ خبر کہ چیستی و کیستی مگر انداز تو علمی بہم رسانند آنہم مخصوص تو نخواہد بود۔ موش از گربہ و میش از گرگ علیٰ ہذا القیاس ترس دارند و گر عدالت کنی ایں مدح تو قدحے دارد تمام، بز بیچارہ چہ کرد کہ خونش را حلال میدانی، زندگانی تو موقوف بر خونخوار یست ظالم اندکے تامل کن ے

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا — یکدم منافقانہ نشیں در کمین خویش

فرض کردم کہ موقوف بر خونخواری شد زندگانی تو از زیست بز عنداللہ چہ عزیز است تو خود می اندیشی کہ من چیز ہا دارم کہ حیوان ندارد و حیوان ہم بسیار چیز ہا دارد کہ تو نداری۔ حیوان در کدام چیز محتاجِ تست بطورے کہ موجود میشود و عمر بسری برد و میرد ہم ہمیں طور داری

دگر بر علم و فطرت خود لافی، او را چہ خبر باشد کہ او ہم علم و فطرتی دارد کہ ترا چہ اثر ہر کس خود ہیچو خودی
را می پسندد۔

تو خود را می ستائی مثنوی نیست — بذاتی کا ہمچنیں یک عالمے ہست

پس اگر ترا با ایں صفت موصوف سازند دیگرے ہم ہمیں صفت دارد آنکس کیست و
کہ خواہد بود کہ در قید ہیچ پنداری و مذہبی نباشد چناں معلوم میشود کہ ایں وا گذشتگی محال است
باوجود ایں کلمات گوینده ہم بظاہر مشربی دارد چکنند مصلحت اینست۔ آدمی بیچاره در وضع
خود مجبور ہر گاہ موجود شد اطوار مادر و پدر را می بیند و اینہا نمی گذارند کہ مخالف خود راه برود
تا آنجا کہ دلش قایم بر چیزی شد و ہمرنگ آنہا گردید آنوقت از خود نمی تواند کہ از رای خود در گذرد۔

آں یار کہ در حجاب گردید — عالم ہمہ بے حساب گردید
ہر طفل کہ زادہ شد ز مادر — بر دین پدر خراب گردید

کاش دین پدر ہم در خود اختلاف نداشتے نمی بینی کہ از جملہ ادیان یک دین کہ اسلام است
چندیں مذاہب دارد کہ در ہر مذہب چندیں مجتہد اند کہ باہم مختلف اند و مشکل آنکہ از گفتہ کی
راہ باید رفت و دیگر ہا را ہم ہادی باید پنداشت اما اگر ہدایت آن دیگر ہا راہ پیروی نمیگذارد
عجب کیفیتے است۔ حنفی مذہب اگر میل بمذہب شافعی کند واجب التعزیر است، حیرانم کہ اگر
مذہب حنفی برحق و بہمہ وجہ کامل است احتیاج مذہب شافعی و حنبل و مالک چہ ماند و گر مذہب شافعی
کامل است احتیاج آں ہر سہ دیگر چیست و ہمچنیں چند تفاسیر کلام اللہ چہ در کار است۔
مفسران حل مشکل نکردہ اند بل حل را مشکل ساختہ اند، باعث تصنیف اینہا خالی از دو علت
نیست یا ارادۂ اظہار کمال خود کردہ اند یا معانی کلام را بخلاف دیگری موافق رای و مشرب خود
بیان کردہ باشند۔ پس اصل معنی را گویا پوشیدہ اند۔ اگر اختلاف در معنی و مسائل ایشان نمی بودے

جنگ و فساد در عالم نشدے۔ مشکل آنست کہ اول خود را چیزی مثلاً شیعہ یا سنی قرار میدہند
بعد ازاں حرف میزنند۔ [1] پر ظاہر است کہ شیعہ مطابق اعتقاد خود خواہد گفت و سنی موافق آئین
خود، بوالعجب اعتقاد آنہا ہی کہ خلفاء ثلاثہؓ را سزاوار لعن دانند و طرفہ آں کسانے کہ رنجش فاطمہ را
منظور دارند۔ از اینجاست کہ قید مذہب و مشرب اصل خرابی ایمانست خوشا حال دردمندان
الٰہی کہ اینہمہ مایۂ فساد را گذاشتہ در یاد خدا مشغول اند۔ ہر چند بجای نرسند اما ازیں بلا میرہند عباس
ابن یوسف الشکلی البغدادی فرمودہ ہر کہ بحضرت حق سبحانہ مشغول باشد از مذہب او نباید پرسید
حاصل اینہمہ کلام کجا در ضبط آید مجملاً ہمین است کہ حق بطرف ہیچ مذہبی و مشربی جلوہ گر نیست
و دلیل بریں سخن اختلاف یکدیگر اینہاست پس با ہیچ مقدمہ و ہیچ دعوی بی وجود منصفی باثبات
نمی تواند رسید و منصف محال بنظر می آید چہ ہر گاہ فرض کنی میلی بمذہبی دارد و ہر گاہ مایل بطرفی
شد انصاف نماند

گرد ہزار دعوی باطل فشاندہ ایم — اشکی کہ ما ز حسرت انصاف ریختیم

لاچار اعتقاد ایں سراسیمہ حال بر اجماع ایشان آید یعنی ہر چیزی کہ متفق المذہب باشد
در حقیقت او شکی نباید آورد۔ مثلاً بر وجود حضرت باری کہ یکی سنگ قرار میدہند ہمہ اہل مذہب متفق
اند حق باید دانست، پرستش او علی الاطلاق کہ یکی مخصوص بارکان "نداند" راست باید پنداشت،
گرسنہ را خوراندن، برہنہ را پوشاندن و غضب بر کسی نکردن، علی ہذا القیاس بر ہر چیزی ہمہ مخالفان
جمعند حق باید دانست۔

---

[1] پر:- بفتح اول و سکون دوم بمعنی مگر لغت فارسی است در اردوی ہندی مستعمل و یا از توافق لسانین است
وحشی گوید بیت ~ آنکہ ہرگز یاد مشتاقاں بکنوبی نکرد — گر چہ گستاخیست میگوئیم پر خوبی نکرد
بعربی لاکن گویند (نفائس اللغات ص ۱۱۸)

اینہمہ غبار خاطر افشاندم اما میترسم کہ دلت بر بطلانِ مذہب نرود و سخت سادہ لوحی میدانم کہ چنانچہ از جادۂ آئین خود برنمی آئی بحرفی زدین خود میتوانی گذشت بازیچۂ زنداں مشو و آنچہ میگویم بگوش ہوش بشنو بر شریعت حضرت رسول اکرمؐ چنانچہ قایمی قایم باش و انچہ تا ل خلص این کلام است درسخن شریف او مشاہدہ کن اگر نیابی با من بجنگ، مقبول آنست کہ بر جادۂ دین خود مستقل باشد و مردود آنکہ میل بدیگرے نماید فہم من فہم ؎

مدتی شد کہ در خیال خودیم   پرفشاندیم و زیر بال خودیم

گفتگو بیش نیست دنیا و دیں   صاحبِ حال قیل و قال خودیم

منتِ خضر ملحیٔ مرگست

تشنۂ حسرتِ زلالِ خودیم

ہماری نئی کتابیں

دین رحمت ۔ مصنفہ شاہ معین الدین احمد ندوی	قیمت	[illegible]
عہد مغلیہ ہندو مسلمان مورخین کی نظر میں ۔ مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے	؍؍	[illegible]
صاحب المثنوی مولانا جلال الدین رومی کے سوانح و حالات اور انکے کشف و کرامات کا بیان	؍؍	[illegible]
تاریخ سلاطین کشمیر ۔ از ڈاکٹر محب الحسن مترجمہ علی حماد عباسی سابق لکچرر شبلی کالج	؍؍	[illegible]
مقالات سلیمان	؍؍	[illegible]

منیجر

جسٹس بدرالدین طیب جی

اور

انجمن اسلام بمبئی

از جناب عبدالمنان صاحب اعظمی ایم ایڈ

انجمن اسلام بمبئی ایک مفید ادارہ ہے جو عرصہ سے بیش قیمت علمی و تعلیمی خدمات انجام دے رہا ہے، شمالی ہند کے لوگ عموماً اس سے ناواقف ہیں، اس لیے اس کا مختصر سا تعارف شائع کیا جاتا ہے۔ "م"

جسٹس بدرالدین طیب جی نے مغربی ہند میں مسلمانوں کے تعلیمی فروغ کے لیے کم و بیش اتنی ہی جد و جہد کی ہے جتنی سرسید احمد خاں نے شمالی ہند میں۔ فرق صرف یہ ہے کہ سرسید کا منصوبہ حالات کے لحاظ سے، بدرالدین طیب جی کے منصوبہ سے زیادہ وسیع تر اور ہمہ گیر تھا، اگر ایک طرف سرسید کی مساعی نے یونیورسٹی کی شکل اختیار کر کے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تو دوسری طرف بدرالدین طیب جی کی کاوشوں نے بمبئی شہر میں علمی و سماجی اداروں کا جال بچھا دیا۔

آج مہاراشٹر کا یہ دور افتادہ پہاڑی علاقہ اردو زبان اور اس کے علم و ادب کے لیے پناہ گاہ کا حکم رکھتا ہے، اس میں سب سے زیادہ حصہ بدرالدین طیب جی اور ان کی قائم کردہ انجمن اسلام کا ہے۔ انجمن اسلام اور بدرالدین طیب جی دونوں ہم معنی لفظ ہیں، ایک کو قطع نظر کر کے دوسرے کا تذکرہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

بدرالدین طیب جی ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۴ء میں بمبئی کی سرزمین میں پیدا ہوئے، ان کے والد طیب علی بمبئی کے ممتاز تاجر تھے، اس زمانہ کے رواج کے مطابق گھر پر قرآن کی تعلیم ہوئی، پھر ایک مقامی مکتب، مدرسہ دادا مقبہ میں داخل کردیے گئے جہاں انھوں نے اردو، فارسی، گجراتی اور حساب وغیرہ کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد الفنسٹن انسٹی ٹیوشن میں داخلہ لیا جہاں انکے دو بھائی پہلے سے زیر تعلیم تھے، اس زمانہ میں اس اسکول میں یہی صرف تین مسلمان طالبعلم تھے،

یہاں سے میٹرکولیشن کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی غرض سے لندن چلے گئے، وہاں ۷ سال رہ کر قانون کی اعلیٰ ڈگری اور انگریزی میں مہارت تامہ حاصل کرلی، لندن کے دوران قیام میں آپ کی ملاقات فیروز شاہ مہتا اور دادا بھائی نوروجی سے ہوئی جن سے ہمیشہ تعلقات قائم رہے۔

۱۸۶۷ء میں بدرالدین طیب جی بمبئی واپس آئے، ان کی واپسی ٹائمس آف انڈیا نے لکھا تھا کہ

"بدرالدین طیب جی پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے اتنی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور بیرسٹر ہوئے۔"

لندن میں قیام اور اعلیٰ تعلیم کے باوجود ان کا دامن لہو ولعب سے کبھی آلودہ نہ ہوا، لندن کے قیام کے زمانہ میں بھی اسلامی شعائر کی پابندی کا اہتمام رہا، ان میں قومی حمیت وخودداری بدرجہ اتم موجود تھی، طبعاً انتہائی متین اور بردبار تھے، بقول فیروز شاہ مہتہ "انھوں نے (طیب جی) اپنی کارکردگی حسن اخلاق وادب اور جرأت وہمت سے عدالت تک کو متاثر کردیا تھا، وہ دفاع کرنا بھی خوب جانتے تھے اور حملہ کا جواب بھی خوب دیتے تھے۔"

۱۸۷۰ء میں بیرسٹری شروع کرنے کے تین سال بعد عوامی مسائل میں دلچسپی لینا شروع کردیا، اس وقت بمبئی پریسیڈنسی کے مسلمانوں میں تفریق وانتشار، بدنظمی اور بے حسی

کا دور دورہ تھا، اور تعلیمی حالت اس سے بھی بدتر تھی،

بمبئی شہر میں تقریباً ایک سو گیارہ مکتب یا مدرسے تھے، جن میں قرآن خوانی، اردو، فارسی وغیرہ کی ابتدائی تعلیم ہوتی تھی، لیکن انگریزی تعلیم کے لیے ایک اسکول بھی نہ تھا، اسکے مقابلہ میں پریسیڈنسی میں انگریزی، مراٹھی اور گجراتی ذریعہ تعلیم کے اسکولوں کا جال بچھا ہوا تھا، مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کوئی ایسا ادارہ نہیں تھا جہاں وہ اپنی زبان، مذہب اور کلچر محفوظ رکھتے ہوئے انگریزی تعلیم حاصل کرسکیں، مسلمان اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں اس لیے نہیں بھیجتے تھے کہ ان میں تعلیم سے مذہب کو خطرہ تھا، جن اسکولوں میں مراٹھی اور گجراتی ذریعہ تعلیم تھیں ان سے اس لیے کنارہ کش رہے کہ ان میں تعلیم سے ان کی زبان اور تہذیب محفوظ نہ رہتی تھی، اس لیے مسلمان تعلیم میں بہت پس ماندہ تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ

پونا ہائی اسکول کے ۵۰۴ طلبہ میں صرف ۱۲ مسلمان تھے، رتنا گیری ہائی اسکول میں ۱۷۹ طلبہ میں مسلمان صرف ۱۰ تھے، الفنسٹن ہائی اسکول بمبئی کے ۵۹۵ طلبہ میں مسلمان صرف ۱۷ تھے، سفیٹ زیویر ہائی اسکول کے ۵۰۶ طلبہ میں مسلمان ۱۹ تھے،

یہ اعداد وشمار بدرالدین طیب جی کے میموریل سے لیے گئے ہیں، جو ۱۸۸۲ء کے ایجوکیشن کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا تھا،

اس صورت حال کو دیکھکر بدرالدین طیب جی نے تعلیمی تحریک اٹھائی اور اپریل سنہ ۱۸۷۶ء میں انجمن اسلام سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا، جس کے صدر قمرالدین طیب جی اور نائب صدر ناخدا محمد علی روگھے منتخب ہوئے، اس وقت بدرالدین طیب جی کی عمر صرف ۳۲ سال تھی۔

شروع شروع میں انجمن کے اغراض ومقاصد میں مسلمانوں کی سیاسی، تہذیبی

اور تعلیمی ترقی سب شامل تھی، لیکن بعد میں اسے صرف تعلیمی امور تک محدود کر دیا گیا۔

انجمن اسلام ہائی اسکول جون ۱۸۸۰ء میں تجربہ کے طور پر گوکل داس تیج پال اسکول میں اردو کلاس کا اجرا کیا گیا، لیکن پھر اندازہ ہوا کہ یہ کافی نہیں بلکہ ایک مستقل اسکول کی ضرورت ہے، چنانچہ اسی سال ستمبر میں حاجی زین العابدین کے امام باڑہ میں ایک اسکول کھولا گیا جسے آغا عبدالحسین نے انجمن کو عطا کیا تھا، اس وقت اس اسکول میں ایک ہیڈ ماسٹر، تین استاذ اور تینتیس ۳۳ طلبہ تھے لیکن سال کے آخر میں طلبہ کی تعداد ۲۰۵ اور اساتذہ کی تعداد ۹ تک پہنچ گئی، اور داخلہ کے لیے طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوا کہ یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی، اس لیے بدر الدین طیب جی نے اسکول کی مستقل عمارت کے لیے کوشش شروع کردی، ناخدا محمد علی روگھے نے دس ہزار اور بدرالدین طیب جی نے سات ہزار روپیے دیے، سب ملا کر ۴۸۰۰۰ روپیے وصول ہوئے، مگر یہ رقم ایک عمارت کے لیے بہت کم تھی، اس لیے مزید رقم کے حصول کی کوشش برابر جاری رہی، اور اسکول مختلف مکانوں میں منتقل ہوتا رہا، اسی دوران میں حکومت نے ۱۸۸۱ء میں چھ ہزار کی اور بمبئی میونسپلٹی نے پانچ ہزار سالانہ کی گرانٹ منظور کی۔

اسکول کی نئی عمارت عمارت کے لیے ایک عمدہ قطعہ کا حصول بڑا مشکل کام تھا، ۱۸۸۵ء میں حکومت نے بوری بندر اسٹیشن کے بالمقابل ایک قطعہ زمین انجمن کو مفت دیدیا اور ۲۰۰۰۰ روپیہ نقد بھی عنایت کیا، اس طرح ۲۰ مارچ ۱۸۹۰ء میں گورنر بمبئی لارڈ رے کے ہاتھ عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اور ۲۷ فروری ۱۸۹۳ء میں اسکول اس نئی عمارت میں منتقل ہوگیا، اس وقت طلبہ کی تعداد ۶۲۸ ہو چکی تھی، عمارت ۱،۳۹،۰۰۰ میں تیار ہوئی۔

بدرالدین طیب جی صدر انجمن ۱۸۸۹ء میں بدرالدین طیب جی انجمن کے صدر، اور ۱۸۹۵ء میں بمبئی ہائی کورٹ کے جج اور ۱۹۰۲ء میں ایکٹنگ چیف جسٹس مقرر ہوئے، اس دوران میں

آپ کی صحت خراب ہوگئی، اس لیے علاج کے لیے لندن تشریف لے گئے، اور وہیں ۱۹۰۶ء میں یہ درخشندہ ستارہ غروب اور ملک اس کی روشنی سے محروم ہوگیا، ۹/ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو لاش بمبئی لاکر دفن کی گئی۔

انجمن اسلام پر جمود بدر الدین طیب جی کی وفات کے بعد انجمن پر ایسا جمود طاری ہوا کہ تین ۳ برس تک کسی نئے اسکول کا قیام عمل میں نہ آسکا۔ احمد سیلر اسکول یوں تو ۱۸۸۲ء میں قائم ہو چکا تھا، جو ۱۹۰۷ء میں مڈل اسکول ہوا اور ۱۹۴۳ء میں ہائی اسکول ہوا۔

بیرسٹر سیف طیب جی لیکن خوش قسمتی سے اسی خاندان میں پھر ایک شخص پیدا ہوا، جسے طیب جی ثانی کہنا غلط نہ ہوگا، انھوں نے انجمن میں نئی زندگی پیدا کی اور متعدد بڑے بڑے اداروں کا قیام ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے، اس وقت انجمن اسلام حسب ذیل ادارے چلا رہی ہے:

ادارہ		تعداد طلبہ ۶۵-۱۹۶۴ء	اخراجات
(۱) انجمن اسلام ہائی اسکول	(۱۸۸۰ء)	۱۴۱۱	۳،۳۱،۳۵۴
(۲) احمد سیلر ہائی اسکول	(۱۹۰۷ء)	۴۲۹	۵۲،۸۳۵
(۳) انجمن اسلام گرلز ہائی اسکول	(۱۹۳۶ء)	۲۳۱۰	۲،۲۰،۲۶۴
(۴) انجمن اسلام ماہم گرلز ہائی اسکول	(۱۹۴۱ء)	۹۲۷	۱،۵۳،۶۹۹
(۵) انجمن اسلام جان محمد قاسم ہائی اسکول	(۱۹۴۳ء)	۱۶۸	۴۷،۸۳۴
(۶) عبدالستار شعیب مڈل اسکول	(۱۹۴۴ء)	۱۵۶	۲۳،۹۱۰
(۷) جان محمد قاسم کمرشیل اسکول	(۱۹۴۴ء)	۷۹	۸،۰۵۰
(۸) انجمن اسلام سوبانی نائٹ اسکول	(۱۹۴۴ء)	۱۱۰	۲،۲۸۸
(۹) صابو صدیق پالی ٹکنک	(۱۹۳۶ء)	۷۸۸	۴،۱۹،۲۹۱
(۱۰) انجمن اسلام کرلا ہائی اسکول	(۱۹۴۷ء)	۶۳۸	۹۸،۵۰۴

(۱) انجمن اسلام پنج گنی ہائی اسکول (۱۹۵۸ء) تعداد طلبہ ۱۹۶۵ء میں ۲۴۰ اخراجات ۱۹۶۵ء ۵۹,۵۶۳

۷,۵۷۹ ۱۳,۶۳,۱۳۲

(۱) بیت المال کا قیام (۲) اے ڈی بادلا (۱۹۵۷ء)

دوسرے ادارے ان کے علاوہ مختلف قسم کے علمی و تعلیمی ادارے قائم ہوئے جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) کریمی لائبریری (۱۸۹۹ء) (۲) سوبانی ہاسٹل (۱۹۰۲ء)

(۳) اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (۱۹۴۷ء) (۴) ادبی پرنٹنگ پریس (۱۹۵۷ء)

انجمن کے پیش نظر بعض نئے منصوبے ہیں جو رفتہ رفتہ پورے ہوں گے۔

اس طرح آج سے ۸۰ سال قبل جہاں ایک اردو کلاس کا اجراء کیا گیا تھا وہاں اب گیارہ ہائی اسکول ہیں، جن میں سات اسکولوں کی اپنی ذاتی عمارتیں ہیں، طلبہ کی تعداد ۳۳ سے بڑھ کر ۱۹۶۵ء میں تقریباً ۷,۵۷۹ ہوگئی ہے، اسکول کے پہلے سال کا خرچ ۵۹ ہزار تھا، آج انجمن کے تمام اسکولوں کا سالانہ خرچ ۱۳,۶۳,۱۳۲ تک پہنچ گیا ہے، یتیم خانوں کا خرچ اور اس کی ملکیت اس کے علاوہ ہے، اس کے علاوہ طلبہ کے ۳۸ اسکالرشپ ہیں، جن کی مجموعی رقم ساڑھے پانچ لاکھ کے قریب ہے، تین ٹرسٹ کی رقم جو انجمن کے انتظام میں ہیں ۲۵,۸۶,۷۵۶ ہے۔ دو یتیم خانوں کی املاک مع زمین و عمارت تقریباً سوا چھ لاکھ ہے۔ ان سب کی مجموعی رقم ۳۷ لاکھ ۱۶ ہزار، سو ۵۶ ہوتی ہے۔

جائداد غیر منقولہ میں انجمن کی نو عمارتوں کی املاک کی قیمت کم از کم پچاس لاکھ ہے اور اگر کریمی لائبریری کی نو ہزار اور اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی دس ہزار کتابیں اور انکے فرنیچر وغیرہ کو شامل کر لیا جائے تو انجمن اسلام کے اداروں کی ملکیت ایک کروڑ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

اس کے علاوہ انجمن کے بہت سے منصوبے ہیں جو ابھی تک شرمندۂ عمل نہیں ہوئے، مگر ان پر عمل درآمد کی حتی الوسع کوشش ہو رہی ہے۔

یہ انجمن اسلام کے علمی و تعلیمی کاموں کا ایک سرسری جائزہ ہے، اس موضوع پر ایک مستقل مقالہ راقم نے تحریر کیا ہے جو انگریزی میں ہے، اس پر بمبئی یونیورسٹی نے راقم کو ماسٹر آف ایجوکیشن کی ڈگری دی ہے، یہ مقالہ ایک بڑے ماہر تعلیم پروفیسر عبد الرؤف صاحب کے زیر نگرانی لکھا گیا ہے۔

اثاراتِ تحریر

مکتوب مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی

فرنگی محل لکھنو — مورخہ یکم اگست ۱۹۳۹ء

حضرت مولانا المحترم المعظم دام بالمجد والکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ بعد تسلیمات گذارش ہے کہ والا نامہ کئی دن ہوئے شرف صدور لایا تھا، مگر بعض وجوہ سے مجھے تاخیر ہوئی، بہر حال جواباً گذارش ہے کہ مولانا بحر العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے ترکِ وطن کا جو سبب اُن کے بڑے صاحبزادے نے رسالہ قطبیہ میں تحریر فرمایا ہے اسکی نقل بجنسہ ارسال خدمت کرتا ہوں، اس رسالہ کے مصنف کا نام مولانا عبد الاعلیٰ (ابن بحر العلوم) ہے، رسالہ قطبیہ مولانا بحر العلوم کی حیات میں لکھا گیا جبکہ مولانا بوہار میں تشریف فرما تھے لیکن مصنف خود لکھنؤ میں مقیم تھے، اسی کے ساتھ اغصان اربعہ مؤلفہ مولانا ولی اللہ رحمۃ اللہ کی بھی عبارت ارسال خدمت ہے، یہ امر کہ دونوں میں تھوڑا فرق ہے، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ مولانا ولی اللہ مؤلف اغصان اربعہ ملا محب اللہ کے پوتے تھے اور مؤلف رسالہ قطبیہ مولانا بحر العلوم کے صاحبزادے تھے، یہ امر شاید جناب کے علم میں ہوگا کہ مولانا بحر العلوم کے بعد ان کے

احفاد اور دیگر تمام علمائے فرنگی محل سے خاندانی چشمک تھی، گو اس کے اثرات فرنگی محل کے باہر بہت کم ظاہر ہوئے تھے، اسی قسم کا ایک واقعہ ملا حسن رحمہ اللہ کے ساتھ بھی شیعوں کا پیش آیا تھا، اور اسی بنا پر ملا حسن کو بھی ترکِ وطن کر کے رامپور جانا پڑا تھا مجھے ظاہرا صاحب اغصان کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے، والعلم عند اللہ۔

ایک امر اور لکھ دینا ضروری ہے کہ مولانا بحر العلوم کے تشریف لے جانے کے بعد ملا محب اللہ اور مولانا بحر العلوم سے بظاہر تعلقات بہت صاف معلوم ہوتے ہیں، ملا محب اللہ نے اپنے دونوں یتیم کمسن بھائیوں یعنی حضرت مولانا انوار الحق اور مولانا اظہار الحق قدس اللہ اسرارہما کو باصرار مولانا بحر العلوم کے پاس شاہجہانپور تحصیل علم کے لیے بھیجا اور ان دونوں بھائیوں نے مولانا کے پاس کئی سال رہ کر اعلیٰ کتب مولانا ہی سے پڑھ کر فاتحۃ الفراغ بھی مولانا ہی سے پڑھا، اس کے علاوہ مولانا کی دو صاحبزادیاں ملا محب اللہ کے گھر بیاہی تھیں، یہ شادیاں اس واقعہ کے بعد کی ہیں یعنی ایک صاحبزادی ملا محب اللہ کے چھوٹے بھائی مولانا اظہار الحق کو اور دوسری صاحبزادی ملا محب اللہ کے بھتیجے ملا علاء الدین خلف حضرت مولانا انوار الحق قدس اللہ سرہ کو، ملا علاء الدین حضرت استاذی و مرشدی مولانا عبد الباری قدس اللہ سرہ کے دادا کے دادا تھے، ملا علاء الدین مولانا بحر العلوم کے ساتھ ہمیشہ مدراس ہی میں مقیم رہے، اور مولانا کی وفات کے بعد ان کے جانشین اور ان کے خطاب ملک العلماء کے مالک ہوئے،

دوسرے امر کے متعلق گذارش ہے کہ حضرت ملا مبین کی کتاب وسیلۃ النجاۃ کے خطبہ کی عبارت (بقدر ضرورت) ارسال ہے، جس سے معلوم ہو جائے گا کہ کسی شیعہ کے مباحثہ کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت ملا مبین رحمۃ اللہ اور

سلطان العلماء مولوی سید محمد بن مولوی دلدار علی اور غالباً شیخ امام بخش ناسخ میں بہت دوستی تھی اور تینوں صاحب بعد عصر ملا مبین صاحب کی بیوی کی تیار کردہ مسجد کے دروازے کے اوپر ایک برآمدہ نما جگہ تھی (جو چھ سات سال قبل موجود تھی) اس میں بیٹھا کرتے تھے اور وہیں مولوی سید محمد صاحب سے کبھی کبھی دوستانہ مباحثہ ہوتا تھا، ان ہی کے اعتراض کے جواب میں کتاب لکھی گئی ہے، مگر اس قصہ کی تصدیق کسی تحریر سے مجھے نہیں ہو سکی، والعلم عند اللہ۔ اہل سنت خطبوں اور محافل میلاد یعنی شریف میں بلا کسی روک ٹوک کے مدائح صحابہ بیان کرتے تھے، مگر ان کے علاوہ پبلک مقامات کے متعلق مجھے علم نہیں ہے، البتہ بزرگوں سے سنا ہے کہ بادشاہ کی اجازت سے آٹھویں یا نویں محرم کو کوئی شاہی خدمتگار جو سنی تھا وہ علم نکالا کرتا تھا، اور ہر شخص کو جو راستے میں مل جائے اس کو دم چار یار کہنے پر مجبور کرتا تھا، چاہے وہ سنی ہو یا شیعہ، صرف یہی واقعہ سنا تھا اس کو حوالہ قلم کر دیا۔

امید کہ مزاج عالی مع الخیر ہوگا، زیادہ کرم۔ فقط

فقیر محمد عنایت اللہ عفا اللہ عنہ

۱۴؍ جمادی الاخری ۱۳۵۸ھ، چہارشنبہ

مکتوب پروفیسر نواب علی مرحوم

لکھنؤ لال باغ ۲۶؍ ستمبر ۱۹۴۳ء

مکرمی! السلام علیکم

آپ کی دونوں تحریروں نے جو ایک ہی ہفتہ میں موصول ہوئیں قند مکرر کا مزہ دیا، ع

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

مؤطا کے اختلاف نسخ کی کرامت دیکھئے کہ شاہ صاحبؒ کی مطبوعہ شرحوں میں بھی اختلاف

پیدا ہوگیا، "سادہ لوحان زمان ما" والی عبارت میرے نسخہ مصفی میں بھی مل گئی، لیکن فضائل شیخین کے بعد شاہ صاحب کی تنبیہ کا عنوان جو آپ نے نقل کر کے بھیجا، وہ میرے مصفی اور مسوی دونوں کے آخر میں نہیں ہے، میرے نسخہ میں آخر روایت مالک عن یحییٰ بن سعید عن عبدالرحمن بن القاسم عن اسلم مولیٰ عمر بن الخطابؓ ہے، جس میں شرب نبیذ کا ذکر ہے، (ص ۲۷۹، جلد ثانی)، اسکے بعد "خلاصہ تحریر مولوی محمد عاشق تلمیذ مصنف" فارسی میں درج ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ مسودات مصفی کی "ترتیب و تہذیب" نہیں ہوئی تھی کہ شاہ صاحب نے رحلت فرمائی، ۶-۷ ماہ بعد ایک صالح شخص نے حضرت کو خواب میں دیکھا، فرماتے ہیں، ترجمہ مصفی کا مجھے بہت شوق ہے، یہ خواب محمد عاشق سنکر خواجہ محمد امین تلمیذ و محرم خاص حضرت کے پاس گئے، وہ مسودات مصفی اٹھا لائے، پھر مسوی کو پیش نظر رکھ کر "ترتیب و تبییض" کا کام سرانجام دیا، ۱۱۷۹ھ میں (یعنی شاہ صاحب کی وفات کے تین سال بعد) یہی وہ مبیضہ ہے جس کا پہلا حصہ شعبان ۱۲۹۳ھ میں مطبع فاروقی دہلی سے اور دوسرا حصہ اسی سال مطبع مرتضوی دہلی سے شائع ہوا، یہ مطبوعہ نسخہ ہی میرے پیش نظر ہے، شاہ صاحب نے پہلے ایک مختصر حاشیہ عربی میں لکھا تھا، جو ۲۶ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۴ھ یوم جمعہ کو ختم ہوا، اور اس کا نام مسوی رکھا، یہ مصمودی موطا کی متن کا حاشیہ ہے، جس کی صورت یہ ہے، مثلاً

كتاب الصلوٰة مالك عن عمه ابی سهيل .... فقال رسول الله صلى الله

عليه وسلم افلح ان صدق[1]

مسوی تمام تر حاشیہ مختصر ہے، جو مصمودی موطا کی شرح فارسی مصفی کے حاشیہ پر

[1] قلت وفی الحدیث دلیل علی ان صلوٰة الوتر وصلوٰة العیدین تطوع وعلیہ الشافعی .....

وقولہ افلح ان صدق معناہ ان لا یؤخذ بترک غیر الفرض۔ مسوی برحاشیہ

طبع ہوا ہے، شاہ صاحب نے اگرچہ اپنے طور پر فقہی ترتیب سے احادیث درج کی ہیں لیکن احادیث
وہی ہیں جو بروایت یحییٰ مصمودی ہیں، پھر اس کی شرح مصفّیٰ بترتیب و تہذیب ان کے شاگرد،
خواجہ محمد امین کی ہے، معلوم نہیں آپ کے رفیق نے کس مطبوعہ نسخہ مصفّیٰ کو دیکھا جس میں فضائل
شیخین کے بعد شاہ صاحب کی تنبیہ نقل کی ہے جو میرے نسخہ میں نہیں ہے، میرا نسخہ غالباً آپ کے
نزدیک بھی اب زیادہ صحیح اور معتبر سمجھا جائے گا، لیکن اگر شاہ صاحب کی تنبیہ الحاقی نہیں ہے،
تب بھی مطلب صاف ہے، فضائل شیخین کے بعد "مقام مقتضی آں بود" کے مطابق شاہ صاحب
فضائل حسنین ہی لکھنا چاہتے تھے، مگر مصمودی مؤطا میں "چیزے از یں باب" (یعنی سیرت حضرات
عثمانؓ و علیؓ و دیگر صحابہؓ) منقول نہ تھی، اس لیے انھوں نے وہیں ختم کردیا، "شرط کتاب"
کے باعث بہر حال یہ ضمنی بحث ہے، اصل سوال میرا ابتدا میں یہ تھا کہ کیا مؤطا میں معراج
کا ذکر نہیں ہے، اس کا جواب مجھے میرے مطبوعہ نسخہ کے صفحہ ۱۱، جلد ثانی میں حدیث اسریٰ
سے مل گیا جو میں نے آپ کو لکھ بھیجی تھی،

میں تسلیم کرتا ہوں کہ "باب الرقیہ من عفاریت الجن" "در افسوں خواندن از عفاریت
جن" شاہ صاحب کی عبارت ہے، لیکن مالک عن یحییٰ بن سعید انہ قال اسریٰ برسول اللہ
الحدیث، جس میں رسول اللہ ﷺ نے اعوذ بوجہ اللہ الکریم ...... یا رحمٰن کی دعاء
تعلیم فرمائی، مصمودی مؤطا کی اصل عبارت ہے اور اسی کا فارسی ترجمہ شاہ صاحب نے
"بردہ شد آنحضرت را در شب معراج پس دید دیوے را از جنیان میخواست کہ ضرر رساند
بآنحضرت بشعلہ از آتش ...... درج کیا ہے، امید ہے کہ اب مشکل حل ہو جائے، آپ کو
زیادہ زحمت دینا نہیں چاہتا، خدا کرے آپ کی طبیعت درست ہوگئی ہو، ندوہ کے واسطے
اس ماہ مبارک میں خدا کرے کچھ رقم جمع ہو جائے، مخالف مضامین کا سلسلہ اب تک جاری ہے،

ہر طرف بدظنی پھیل رہی ہے، نعوذ باللہ من شرور انفسنا ۔ فقط والسلام

نواب علی

مکتوب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

۱۵ اکتوبر ۱۹۲۶ء

حیدرآباد دکن جام باغ، ترپ بازار

مخدوم و محترم زادکم اللہ مجداً و شرفاً،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ ایک ایسے شخص کو جس کا ہر دن اور ہر سال تاریخی ہو، اس کو
کن کن باتوں کی مبارک باد دی جائے، تاہم اس کی تبریک تو شرعی طور پر واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ
نے اپنے فضل و کرم سے حج و زیارت کے شرف سے مشرف فرمایا، حجاً مبروراً و ذنباً مغفوراً
باقی ریاستِ وفد، نیابتِ معتمدیِ موتمر، اور ازیں قبیل آپ صبح و شام جو کچھ بنتے رہتے ہیں
اس کی نہ حد ہے نہ اس کا حساب، ابھی تو آپ کو بہت کچھ بننا ہے، اللھم زد فزد، دوسروں
کو بھی بنایئے اور خود بھی بنیے، اور خود کو اس وقت بنتا ہے جب اس کے بنانے کی فکر
چھوڑ دی جائے،

اس وقت اس عریضۂ نیاز کے لکھنے کی ایک خاص وجہ ہے، دائرۃ المعارف میں
مستدرک حاکم کا جو نسخہ مطبوع ہوا، اور اس کے متعلق آپ کے رسالہ میں تنقید شائع ہوئی،
اس کا جواب مولوی سید ہاشم سلمہٗ نے دیا، ان تمام امور کی آپ کو واقفیت ہے، حیدرآباد
میں آپ محبوب ہی نہیں ہیں، محسود بھی ہیں، حالانکہ بات معمولی ہی ہے لیکن قطرہ کو طوفان
بنانے کا تہیہ کیا جا رہا ہے، اس لیے خلوص کا مقتضا ہوا کہ آپ کو اس کی خبر کردوں اور

عرض کروں کہ اس معاملہ کو بآسانی ختم فرما دیجئے، میرا خیال ہے کہ ہاشم کا جواب یا اس کا خلاصہ معارف میں شائع کر دیجئے، آپ نے شذرات میں شاید ابوالجلال صاحب کی تنقید کے متعلق چند اعتمادی الفاظ لکھے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ غالباً اس کے چند مباحث کو غور طلب بتایا ہے، اسی "غور طلب" کے سلسلہ میں ندوہ ہی کے ایک عالم کا مضمون شائع ہونا "داب معارف" کے خلاف بھی نہیں ہے، مقصود صرف اس قدر ہے کہ "دوختہ بہ" پر عمل کیا جائے، امید ہے کہ اس مشورہ کو آپ پسند فرمائیں گے، مولوی مسعود علی صاحب کو میرا اسلام پہنچا دیجئے، ان کی دعاؤں کا آرزومند رہتا ہوں، مولانا حمید الدین صاحب سے میرا اسلام بصد نیاز پہنچا دیجئے، مولوی عبدالباری صاحب بعافیت ہیں، اپنی بیماری میری طرف منتقل کر دی ہے، فقط

نیازمند

مناظر احسن گیلانی

مکتوب نواب سید محمد علی حسن خاں

مخدوم محترم جناب علامہ سید سلیمان صاحب ندوی زاد مجدکم

تسلیم و نیاز، میں نے ایک عریضہ بتاریخ ۲۲ جولائی ۱۹۳۰ء بجواب گرامی نامہ مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۳۰ء موصولہ ۱۹ جولائی ۱۹۳۰ء ارسال خدمت کیا ہے، میں اس کے جواب کا بیتابانہ انتظار کر رہا ہوں، براہ کرم و نوازش قدیمانہ جلد جواب سے مطمئن و مسرور فرمائیں، بحالت اضطراب و شعبۂ اختیار حقیقت دل کے ترجمان بنگئے، امید ہے کہ نظر لطف ان پر مبذول ہوگی[1]

اندکے صبر بود کار ترا بائستے — انچہ آمد بہ عمل از تو مرا بائستے

آں خلوصیکہ مراہست بذات اشرف — نظر عفو تو بہ سہو و خطا بائستے

(۱) حاشیہ ص ۱۴۹ پر ملاحظہ ہو)

ارسال پوسٹ کارڈ کی بحالت عجلت معافی چاہتا ہوں،

خاکسار

محمد علی حسن، ۲۹ جولائی ۱۹۳۰ء

(ایضاً)

مخدوم محترم جناب علامہ سید سلیمان صاحب ندوی زاد مجدکم

تسلیم و نیاز۔ آپ نے از راہ کرم میری عزیزانہ شکایت پر یہ تو تحریر فرمایا کہ انشاء اللہ آئندہ شکایت کا موقع نہ ملے گا، مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ قصد لکھنؤ کب تک ہے۔

عزیزی اچھے صاحب سلمہٗ روانگی اعظم گڈھ کے لیے تیار تھے، میاں مشتاق علی صاحب کو بھی انھوں نے رحیم آباد سے اپنی معیت کے لیے بلایا تھا، مگر بعض خانگی مجبوریوں سے یہ ارادہ ہنوز پورا نہ ہوسکا اور مجھکو بھی دریافت کرنے کا موقع نہ ملا کہ اب کب تک قصد روانگی ہے، آج دریافت کروں گا۔

آپ نے تذکرۂ صبح گلشن کی نسبت دریافت فرمایا ہے، بجواب والا نامہ گذارش ہے کہ میری عمر اس وقت دوازدہ سال کی تھی لیکن استاذ مرحوم کے فیض صحبت سے مذاق سخن پیدا ہوچکا تھا، اس لیے میں نے بمشورۂ استاذ محترم مولوی محمد احسن صاحب مرحوم اور بمدد جناب

(۱) حاشیہ ص ۱۴۸) غالباً ندوہ کے کسی انتظامی معاملہ میں سید صاحب کو نواب صاحب سے جو اس زمانہ میں ندوہ کے ناظم تھے، شکایت ہوگئی تھی، اس کی معذرت میں نواب صاحب نے یہ اشعار لکھے تھے، سید صاحب نے اس کے جواب میں جو اشعار لکھے تھے وہ اتفاق سے اس کارڈ کی پشت پر تحریر ہیں

لطف تو چارہ گرے درد مرا بایستے — حسن ظن با علم نیز ترا بایستے

در میان طلب حق دعا فرقے ہست — انچہ من می طلبم از تو عطا بایستے

مولوی سید یوسف علی صاحب مرحوم جو تذکرے و بیاضیں اس وقت موجود تھے مختلف اشعار انتخاب کئے تھے، لیکن تکمیل و ترتیب اور دیباچہ حضرت والد مرحوم نے ترتیب دیا، دیباچہ صبح گلشن میں بالفاظ حسب ذیل تصریح موجود ہے، اطلاعاً گذارش ہے۔

"خضر این وادی و ساقی این نادی مولوی سید محمد یوسف علی صاحب کارپرداز استاذ علیہ ولیعهد ریاست راز از جا برانگیختم و بدستیاری امداد جناب موصوف رنگ تلاش و تحقیق ریختم تذکرہ ہائے جدید چوں آفتاب عالمتاب قاضی محمد صادق خاں اختر و نشتر عشق حسن علی خاں عاشق عظیم آبادی و دیگر تا جہائے شاذ و نادر کہ نزد مولوی صاحب بودند درے از تحقیق حال کشودند"

امید ہے کہ مزاجِ عالی بعافیت ہوگا۔

تاخیر جواب کا معافی خواہ ہوں

ہر دو عزیز ال امیر حسن و شمس الحسن سلمہم سلام نیاز عرض کرتے ہیں

بخدمت مکرمی جناب مولوی مسعود علی صاحب سلام اشتیاق قبول ہو

خاکسار

محمد علی حسن، ۱۰ر مارچ ۱۹۳۳ء

مکاتیب شبلی اول و دوم

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ۔

اول ضخامت ۱۹۴ صفحے قیمت سےر

دوم " ۲۶۴ " " صر

منیجر

ادبیات

"یہ کیا دیکھ رہا ہوں"

از جناب قمر سنبھلی

ارزاں میں بہت خونِ بشر دیکھ رہا ہوں — برہم سی زمانے کی نظر دیکھ رہا ہوں

حالاتِ چمن آج دگر دیکھ رہا ہوں — ہر گام پہ اک فتنۂ و شر دیکھ رہا ہوں

گلچیں نے وہ توڑے ہیں ستم آج چمن پہ — ہر غنچۂ نو خون سے تر دیکھ رہا ہوں

یہ ظلم کا عالم ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا — خاموش ہوں لٹتا ہوا گھر دیکھ رہا ہوں

چھائی ہے ہر اک پھول کے چہرے پہ اداسی — افسردہ ہر اک غنچۂ تر دیکھ رہا ہوں

سمجھا تھا اب آئی ہے بہار اپنے چمن میں — ہر پھول کو پژمردہ مگر دیکھ رہا ہوں

اللہ رے یہ ظلم و تشدد کہ زمیں پر — انساں کے بکھرے ہوئے سر دیکھ رہا ہوں

مسموم ہیں اس درجہ گلستاں کی فضائیں — کلیوں کے بھی اب چاک جگر دیکھ رہا ہوں

افسوس کہ میں اپنی نگاہوں سے قمر آج
گلزار وفا زیر و زبر دیکھ رہا ہوں

زندگی

از جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

کتنے ہی آدمی پہ ستم ڈھائے زندگی — پھر بھی زباں پہ ہوگا یہی "ہائے زندگی"

با ایں ہمہ کشاکش و غمہائے زندگی ‍ ‍ ‍ ‍ مرتے ہیں زندگی کے لیے وائے زندگی

اے سرخوشانِ نشۂ صہبائے زندگی ‍ ‍ ‍ ‍ کب جادہ ثبات پہ ہے پائے زندگی

ہاں یہ بھی دیکھ اے چمن آرائے زندگی ‍ ‍ ‍ ‍ یادِ سمومِ غم سے نہ مرجھائے زندگی

جن کو نہ فکرِ موت نہ پروائے زندگی ‍ ‍ ‍ ‍ ایسوں سے پیش پائے تو کیا پائے زندگی

داغوں سے لالہ زار ہے دامانِ دل مگر ‍ ‍ ‍ ‍ جاتی نہیں ہے دل سے تمنائے زندگی

ہر چند جورِ چرخ سے ہو جائیں بے دماغ ‍ ‍ ‍ ‍ جاتا ہے کب دماغ سے سودائے زندگی

اندوہ و درد و یاس میں ڈوبی ہوئی حیات ‍ ‍ ‍ ‍ کب اسکی مستحق ہے جو کہلائے زندگی

معلوم ہے حقیقتِ عیش و طرب ہمیں ‍ ‍ ‍ ‍ دے کر حسین فریب نہ بہلائے زندگی

مانا کہ یہ ایک نعمتِ پروردگار ہے ‍ ‍ ‍ ‍ پھر بھی ضرور کیا ہے کہ راس آئے زندگی

آئینۂ زمانہ میں دیکھے جو عکسِ رخ ‍ ‍ ‍ ‍ خود اپنے ہی وجود سے شرمائے زندگی

دیں وہ مسرتیں کہ حیات آئے وجد میں ‍ ‍ ‍ ‍ وہ غم دیے کہ جن سے تڑپ جائے زندگی

واعظ کی بزمِ وعظ میں جاتا تو ہوں مگر ‍ ‍ ‍ ‍ ایسا نہ ہو کہ اور بھٹک جائے زندگی

پھولوں میں رنگ و بو ہے ستاروں میں نور ہے ‍ ‍ ‍ ‍ ہر سمت جلوہ ریز ہے سلمائے زندگی

تم کیا لے کہ نعمتِ ہر دو جہاں ملی ‍ ‍ ‍ ‍ ہیں دامنِ مراد میں گلہائے زندگی

واحسرتا غموں سے ولی آج مرگیا
وہ کشتۂ حیات ہے رسوائے زندگی

باب التقریظ والانتقاد

غریب الحدیث

از جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی

جنوری ۱۹۶۸ء کے معارف میں ڈاکٹر عبد المعید خاں صاحب کا جو مضمون غریب الحدیث کے باب میں شائع ہوا ہے، اس کی ایک کاپی ڈاکٹر صاحب نے مجھکو بھی بھیجی تھی، اور تحریر فرمایا تھا کہ "اگر آپ اس سے اتفاق فرماتے ہیں اور مناسب سمجھتے ہیں تو معارف میں چھپوا دیجئے"۔ میں نے چند توضیحی حواشی لکھ کر اس کو دفتر معارف میں اشاعت کے لیے بھیجا، مگر وہ ڈاک سے ضائع ہو گیا، اس لیے جو کاپی ڈاکٹر صاحب نے براہ راست دفتر کو بھیجی تھی وہ شائع کر دی گئی اور اپنے توضیحی حواشی کے لیے یہ سطریں الگ سے شائع کرانا پڑیں،

میں نے غریب الحدیث کی پہلی جلد ۱۹۶۷ء میں قیمۃً منگا کر اس پر سرسری نظر ڈالی تھی، پھر جلد دوم لغایت چہارم ۱۹۶۷ء میں بقیمت حاصل کی، میں نے جن فروگذاشتوں کی نشاندہی معارف اکتوبر ۱۹۶۷ء میں کی ہے، ان میں سے اکثر اسی وقت سے ذہن میں تھیں مگر تبصرہ لکھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، تبصرہ لکھنے کا محرک تو مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا وہ مضمون ہوا جو معارف میں نکلا تھا۔

پہلی جلد کو دیکھ کر میں خود متحیر تھا کہ کتاب کے شروع میں نہ کوئی مقدمہ ہے نہ آخر میں کوئی غلط نامہ، نہ کہیں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تصحیح کی خدمت کس بزرگ نے انجام دی ہے، تا آنکہ چوتھی جلد نظر سے گذری تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ تصحیح و تعلیق کی خدمت مولانا محمد عظیم الدین صاحب نے انجام دی ہے، اور انھوں نے

اس کو تین سال ڈیڑھ ماہ میں مکمل کیا ہے، لیکن غلط نامہ اور مقدمہ شائع کرنے کا کوئی وعدہ یا اشارہ اس میں بھی نہیں ہے، اس لیے میں نے دائرہ کے اس قابل قدر کارنامہ کی تحسین و ستائش کے ساتھ صرف خدمت علم کی نیت سے چند فروگذاشتوں کی بھی نشاندہی کردی۔

مدینہ منورہ کے نسخہ کی اگر مکمل نقل میرے پاس ہوتی تو میں یقیناً پہلی جلد کو دیکھنے کے بعد ہی ڈاکٹر صاحب کو لکھتا کہ آپ چاہیں تو میں اسے بھیجدوں، مگر میرے پاس تو صرف چند اوراق کی نقل ہے، جیسا کہ میں نے معارف صفحہ ۳۰۷ (اکتوبر) میں صاف صاف اس کی تصریح کردی ہے۔

اب رہی قبل طباعت رہنمائی، تو فروگذاشتوں کی جو نشاندہی میں نے کی ہے، وہ اولاً تو اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تصحیح شدہ مسودہ سامنے نہ ہو، دوسرے جب تک ڈاکٹر صاحب حکم نہ دیں ایسی جرأت نہیں کیجا سکتی، دائرہ کے خطوط میں جو میرے پاس محفوظ ہیں، ڈاکٹر صاحب نے مصححین کی رہنمائی کے لیے کہیں کوئی اشارہ نہیں فرمایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد سے بھی مجھے اتفاق نہیں ہے کہ "مدراسی نسخہ اور مخطوطہ شیخ الاسلام میں بجز اسناد کے کوئی فرق نہیں ہے"۔ اسناد کے علاوہ مزید فرق کی کچھ تفصیلات اکتوبر ۱۹۶۶ء کے معارف ص ۳۱۱ سے معلوم ہوسکتی ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے لیس فی الاصل کی جو توجیہ فرمائی ہے وہ بجا ہے، مگر سقط من پردہ توجیہ چسپاں نہیں ہے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ ہر جلد کا "اغلاط نامہ" اس کے آخر میں ہونا چاہیے مطالعہ کرنے والوں کو اسی میں سہولت ہے، "اغلاط نامہ" کی الگ سے ایک مستقل جلد جو ابھی معلوم نہیں کب تک شائع ہوگی، پڑھنے والوں کے لیے الجھن کا سبب بنے گی۔

مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب میری گذارشوں کو دائرہ کی خیرخواہی پر محمول فرمائیں گے۔

مطبوعات جدیدہ

قرآن محکم ۔ مرتبہ مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۲۰، مجلد مع گردپوش، قیمت عہ پتہ مجلس معارف القرآن، دار العلوم دیوبند۔

عرصہ ہوا مولانا عبد الصمد رحمانی نائب امیر شریعت بہار و اڑیسہ نے یہ مفید رسالہ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے جواب میں تحریر فرمایا تھا، اب اسکو مجلس معارف القرآن دیوبند نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، علمائے اسلام اور مفسرین کی ایک جماعت قرآن مجید میں نسخ "بمعنی ازالہ حکم بحیث لایجوز امتثالہ" کو تسلیم نہیں کرتی، مولانا نے اس رسالہ میں اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے، پہلے انھوں نے ان آیتوں پر جن کو قائلین نسخ دلیل میں پیش کرتے ہیں، گفتگو کی ہے، پھر نسخ کے خیال کے اسباب، قائلین نسخ کے تضاد کی بعض مثالیں اور نسخ کے معنی مختلف مفہوموں کی تعیین کرکے دکھایا ہے کہ گو نسخ خدا کے امکان و قدرت سے باہر نہیں لیکن قرآن میں اس کا کوئی وجود نہیں، آخر میں اُن ۱۹ آیتوں کے متعلق جن کو علامہ سیوطی نے منسوخ بتایا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کا خیال پیش کیا ہے، پھر اُن پانچ آیتوں کی جن کو شاہ صاحب نے منسوخ مانا ہے، توجیہ اور ان کے مفہوم کی وضاحت کرکے دکھایا ہے کہ ان کے منسوخ ہونے کی بھی کوئی وجہ نہیں، اگر مولانا نے سیاق و سباق اور موقع و محل کی روشنی میں بھی آیات کے مفہوم پر روشنی ڈالی ہوتی تو ان کا منشا زیادہ واضح ہوجاتا، اور بعض طویل عربی عبارتوں کے خلاصے اور اصطلاحات کی تشریح بھی کردی ہوتی تو اردو خوانوں کے لیے استفادہ اور آسان ہوجاتا، یہ رسالہ اپنے موضوع پر

نہایت جامع اور اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔

میزان الحدیث ۔ مرتبہ مولانا مفتی محمد قائم عبد القیوم صاحب فرنگی محلی، لمبی و بڑی تقطیع، کاغذ اچھا، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۱۲، قیمت درج نہیں، ناشر تیج کمار پریس، لکھنؤ۔

علمائے فرنگی محل نے دینی علوم کی جو مفید اور شاندار خدمات انجام دی ہیں، یہ کتاب اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی اور اصول حدیث کے مسائل ومباحث پر مشتمل ہے، اس کے لائق مولف مولانا مفتی محمد قائم عبد القیوم فرنگی محلی مدرس اول مدرسہ حنفیہ جونپور کو دینی علوم پر وسعت نظر کے ساتھ درس وتدریس کا بھی تجربہ ہے، یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے، ان میں صحابی، تابعی اور تبع تابعی کی تعریف اور ان کے طبقات، حدیث کی تعریف، اسناد، متن، بیان حدیث کے الفاظ جرح وتعدیل، راویوں کے اسماء والانساب، مختلف اعتبار سے حدیث کی قسمیں، روایت وراوی کے اسباب طعن، کتب حدیث اور محدثین کے مدارج وطبقات، کتب حدیث کے مختلف ناموں، اہم کتب حدیث اور مشہور محدثین کے متعلق معلومات اور معلم ومتعلم کے آداب وغیرہ، حدیث اور اس کے متعلقات کے گوناگوں پہلوؤں اور مختلف قسموں کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور ان کی مثالیں بھی دی گئی ہیں، ہر مبحث میں اس فن کی اہم کتابوں کا نام بھی تحریر کیا گیا ہے، تمہید میں حدیث کی تحریر وکتابت، جمع وتدوین، اس کے مختلف ادوار، ہر دور کے خصوصیات، اس کے نامور فضلاء اور مشہور کتابوں کے علاوہ اصول حدیث اور فن جرح وتعدیل کی اہمیت اور اس موضوع کی مفید کتابوں کا ذکر ہے، اس حیثیت سے یہ کتاب حدیث اور اس کے متعلقہ علوم کی اجمالی تاریخ ہے، اس میں ہندوستانی علماء کی حدیثی خدمات کا بھی مختصر جائزہ لیا گیا ہے، اس سلسلہ میں علمائے اہل حدیث کا ذکر نہ کرنا ایک بڑی کمی ہے، انداز بیان تدریسی ہے، اس سے قطع نظر یہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت جامع اور اصول حدیث کے متعلق گوناگوں ومتنوع اور مفید

معلومات کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے، غالباً ابھی تک اردو میں اس موضوع پر اتنی مبسوط کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، یہ کتاب حدیث پڑھنے پڑھانے والوں کے لیے خصوصیت سے بڑی مفید اور کارآمد ہے۔

صحابیات وعارفات ۔ مرتبہ جناب محمد یونس صاحب قریشی، بڑی تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۰ روپے، پتہ آئینہ بک ڈپو شاہ عالم گیٹ، لاہور۔

یہ کتاب مسلم خواتین کو مغرب زدہ خواتین کی آزادی، بے پردگی، بے راہ روی اور ان کے نتائج سے بچانے اور مومنات صالحات کی زندگی پر عمل کی ترغیب کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں بعثت نبوی سے پہلے اور بعد کی ۷۰ مقدس خواتین کے حالات ومناقب قلمبند کیے گئے ہیں، شروع میں حضرت سارہؑ حضرت ہاجرہؑ حضرت ایوبؑ اور فرعون کی بیویوں اور حضرت مریمؑ کا ذکر ہے، اس کے بعد ازواج مطہراتؓ، بنات وبنین طاہرات اور دوسری مقدس صحابیات اور آخر میں حضرت رابعہ بصری اور چند دوسری زاہدہ خواتین کی عبادت وخدا ترسی، اتباع سنت، عفت وپاکدامنی، گھر کے کام کاج سے دلچسپی، شوہروں کی خدمت، نیکی، تقویٰ اور خیرات ومبرات کے کاموں سے رغبت اور دوسرے فضائل اور پاکیزہ اوصاف وخصائل کا ذکر کیا گیا ہے، گو اس موضوع پر اردو میں متعدد کتابیں موجود ہیں اور مرتب کا ماخذ زیادہ تر یہی کتابیں ہیں، تاہم یہ کتاب بھی مفید ہے، زبان وبیان اور اسلوب نگارش سلیس اور عام فہم ہے۔

مرقع یوسفی ۔ از مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، وطباعت معمولی، صفحات ۲۴۰، قیمت ۱۶ روپے، ناشر مکتبہ معاویہ، بی ون ایریا، قیوم آباد کراچی ۱۹۔

یہ کتاب شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسفؒ کی دس ایمان افروز تقریروں اور بارہ دعوتی و تبلیغی خطوط کا مجموعہ ہے، تقریروں میں بڑے پرسوز اور پراثر انداز میں مسلمانوں کو تعلق باللہ دین کے لیے محنت و قربانی، اصلاح احوال و اعمال اور باہمی وحدت و شیرازہ بندی کی تلقین کی گئی ہے، اور خطوط میں تبلیغ و دعوت دین کے اصول بیان کیے گئے ہیں، شروع میں محمد ایوب صاحب قادری کا مبسوط مقدمہ ہے، جو ہند و پاک اور خصوصیت سے میوات میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور تبلیغی جماعت کے اساطین ثلاثہ مولانا محمد اسمٰعیل، مولانا محمد الیاس اور مولانا محمد یوسف رحمہم اللہ کے حالات اور تبلیغی خدمات پر مشتمل ہے، مولانا محمد یوسفؒ کی تقریروں میں سادگی کے باوجود بڑی تاثیر و جاذبیت ہوتی ہے، یہ تقریریں بھی بڑی پر اثر ہیں، ان کا مطالعہ عام مسلمانوں کے لیے ہم خرما و ہم ثواب ہے، لیکن یہ کتاب جیسی طباعت کی مستحق تھی اس سے خالی ہے۔

رحمۃ المتعلمین - مرتبہ مولانا عبد الرحمٰن اعظم گڈھی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت اچھی صفحات ۱۴۴، قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے، ناشر مکتبہ دار العلوم کراچی ۲۹

یہ رسالہ جو پند و نصائح اور چار ابواب پر مشتمل ہے، عرصہ ہوا چھپا تھا، اب دوسرا اڈیشن مزید اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، پہلے باب میں اساتذہ و معلمین، دوسرے میں طلبہ و متعلمین، تیسرے میں خط و کتابت کرنے والوں اور چوتھے میں عام مسلمانوں کو نہایت مفید دینی و دنیوی نصیحتیں کی گئی ہیں، مصنف نے اپنی تحریر میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تحریر کا جن سے ان کو بڑا تعلق ہے، چربہ اتارا ہے، کہیں کہیں ان کے اور بعض دوسرے بزرگوں کے ملفوظات و معمولات بھی نقل کیے ہیں، اس رسالہ کو حضرت تھانویؒ نے بہت پسند کیا تھا اور اس پر چند سطریں بطور تقریظ تحریر فرمائی تھیں جو شروع میں درج ہے۔

ایک روسی سائنسداں کے تجربات سرخ چین میں مترجمہ جناب پریم گوپال متل، مخمور سعیدی، سعید انجم، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، صفحات ۲۶۸ قیمت عہ، پتہ نیشنل اکاڈمی ۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶

اس کتاب میں ایک روسی سائنسداں ایم اے، کلوچکو نے جواب کناڈا کے شہری بن گئے ہیں، اپنے سفر چین کے مشاہدات و تاثرات قلمبند کیے ہیں، وہ چین کی سائنس اکاڈمی کی درخواست پر سائنسی ریسرچ کے کاموں اور اداروں کی رہنمائی اور اس کی تنظیمی و ترقیاتی اسکیموں میں امداد و مشورہ دینے کے لیے دو مرتبہ ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۰ء میں چین گئے، اسلیے یہ کتاب بھی دو حصوں میں ہے، چین ۱۹۵۸ء میں اور چین ۱۹۶۰ء میں، پہلے حصہ میں آٹھ اور دوسرے میں پانچ ابواب ہیں، مصنف نے چین میں سائنس کی ترقی کے امکانات و موانع اور سائنسی امور و محکموں کے علاوہ چینی عوام و حکومت اور چین کی معیشت و معاشرت اور زراعت و صنعت کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے، اور وہاں کے اہم شہروں کے جغرافیائی و تمدنی حالات بھی بیان کیے ہیں، مصنف کے پہلے سفر کے وقت روس و چین کے تعلقات بہتر تھے لیکن دوسری مرتبہ خراب ہو گئے تھے، اس کشیدگی کے اسباب بھی بیان کیے ہیں، اس کتاب میں دراصل کمیونسٹوں اور کمیونسٹ ملکوں کے اصلی خد و خال کی مصوری اور ان کے غلط دعووں اور جھوٹے و گمراہ کن پروپیگنڈوں کی حقیقت پوری طرح ظاہر کی گئی ہے، ترجمہ نہایت سلیس ہے، کتاب اپنے مفید معلومات کے لحاظ سے مطالعہ کے لائق ہے۔

قید فرنگ مولانا ظفر علی خاں - مرتبہ جناب شورش کاشمیری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۹۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت عمہ ناشر مطبوعات چٹان لمیٹڈ لاہور

جناب شورش کاشمیری مدیر چٹان نے جنگ آزادی کے رہنماؤں کی داستان اسیری قلمبند

کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، اور اس کا آغاز مولانا ظفر علی خاں کی قید فرنگ سے کیا ہے، اس سے پہلے وہ مولانا مرحوم کے حالات و سوانح اور افکار و خیالات پر ایک دلچسپ کتاب لکھ چکے ہیں، اس کتاب میں مصنف نے مولانا کے عہد اسیری کی حکایت کچھ اپنی، کچھ ان کی، کچھ معتبر راویوں کی زبانی اور کچھ ان کے منظوم کلام کی مدد سے بیان کی ہے، اگرچہ اس میں مولانا کی اسارتی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے، مگر اس سے ان کی سیرت و شخصیت اور کمالات کے بعض رخوں کی عکاسی بھی ہوتی ہے، اور جنگ آزادی کے بعض نقوش بھی اجاگر ہوتے ہیں، جناب شورش اور مولانا ظفر علی خاں میں بعض باتیں مشترک ہیں، اس لیے یہ کتاب ظفر علی خاں کی کہانی ان کے متبنی کی زبانی ہے اور اس میں مصنف کی دلکش انشاء کی تمام خوبیاں موجود ہیں،

مثالی خواتین ۔ مرتبہ جناب یونس صاحب ندوی نگرامی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۰ ۔ قیمت ۵۰ نئے پیسے،

پتہ: مکتبہ طیبہ سی ۲۰۷/۴۸ ڈیوڑھی آغا میر، لکھنؤ۔

ہونہار مؤلف نے اس کتابچہ میں بعض صحابیات اور دوسری نیک بخت خواتین کے خشیت الٰہی، اتباعِ سنت، ذوقِ عبادت اور دنیا سے بے رغبتی اور دین سے رغبت و دلچسپی کے موثر اور سبق آموز واقعات سادہ اور آسان زبان اور عام فہم انداز میں لکھے ہیں، مصنف اس طرح کے ہلکے پھلکے کئی مفید کتابچے لکھ چکے ہیں، اس کتابچہ کا مطالعہ مسلم خواتین کے لئے مفید ہے۔

"ض"

جلد ۱۰۱ - ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۸ء - عدد ۳

مضامین